ظہیرالدین احمد ایم۔اے۔ڈی۔لٹ

لامہ اقبال پر تقریروں کی دھوم ہے

ڈیٹر

ید الطاف علی بریلوی

یمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

PRESIDENT'S CAMP
(PAKISTAN)
Nathiagali, June 4, 1959.

From:
Q.U. Shahab, Esquire, SQA, CSP.

My dear Syed Sahib,

Many thanks for your letter No. 41 1/59-60 dated the 26th May, 1959, forwarding a gift copy of your "Talib-Ilm-Ki-Diary".

I have read this absorbing book in one sitting and have thoroughly enjoyed it. Written in your classical style, the Diary gives a vivid and illuminating picture of the times to which it relates. The characterisation of "Bhai Jan" is truly wonderful.

With best regards,

CHECKED 19

Yours sincerely,

Syed Altaf Ali Barelvi,
Secretary A.P. Educational Conference,
Saeeda Manzil, Chaurangi No. 1,
Nazimabad, Karachi

فون نمبر
مکان ۷۹۳۶۹
مہریہ گرلس کالج ۷۹۳۳۶

قیمت
سالانہ آٹھ روپے
فی پرچہ دو روپے

سہ ماہی

العلم

کراچی

جلد ۸ | بابت اپریل تا جون ۱۹۵۹ء | شمارہ نمبر ۲

مطبوعاتِ کانفرنس اکیڈمی

۱۔ ثقافت و انتشار:۔ ترجمہ "کلچر اینڈ انارکی" قیمت ۶ روپے

۲۔ اصول و اساسِ تعلیم:۔ ترجمہ "ایجوکیشن اٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس" ۷ روپے

۳۔ جمہوریت اور تعلیم:۔ حصہ اول۔ ترجمہ "ڈماکریسی اینڈ ایجوکیشن" ۵ روپے

۴۔ جمہوریت اور تعلیم:۔ حصہ دوم ترجمہ "ڈماکریسی اینڈ ایجوکیشن" ۵ روپے

۵۔ پراسرار کائنات:۔ ترجمہ "میسٹریس یونیورس" ۶ روپے

۶۔ مقاصدِ تعلیم:۔ ترجمہ "ایمز آف ایجوکیشن" ۵ روپے

۷۔ اصولِ تدریس:۔ ترجمہ "پرنسپلس آف ٹیچنگ" "ڈابرن اینڈ فورج" ۵ روپے

۸۔ اسلامی نظامِ تعلیم:۔ از پروفیسر سید احمد رفیق قیمت ۳ روپے

۹۔ مسلم خواتین کی تعلیم:۔ از محمد امین زبیری ۲ روپے

۱۰۔ مادری زبان کی تعلیم:۔ از پروفیسر پرنس حسن علوی ۳ روپے

۱۱۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریئے:۔ از محمد حسین خاں زبیری ایم۔اے ۴ روپے

۱۲۔ مکاشفاتِ کشفی:۔ از خان بہادر مرزا ابو جعفر ۳ روپے

۱۳۔ ارتقائے انسانی:۔ از مولانا سید طفیل احمد منگلوری ۲ روپے

۱۴۔ حیات مابعد:۔ از رضا من حسین نقوی گوپال پوری ۳/۸/- روپے

۱۵۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں (دوسرا ایڈیشن) از علامہ سید سلیمان ندوی ۲ دو روپے آٹھ آنے

۱۶۔ طالب علم کی ڈائری:۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی مقدمہ از ڈاکٹر فضرت حسین زبیری

اداریہ

اقبال کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر ظہیر الدین کے لکچر

موسم کم قدری ارباب معنیٰ رفت فت
آمد آمد قبلہ گاہِ نکتہ سنجاں مرحبا[1]

۱۹ر اپریل ۱۹۵۹ء کو حیدر آباد دکن کے مشہور خطیب، فلسفی اور عالم و محقق جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد ایم۔ اے ڈی لٹ (قاہرہ) سابق صدر شعبہ مذہب و ثقافت عثمانیہ یونیورسٹی اقبال اکیڈیمی کی خصوصی دعوت پر کراچی تشریف لائے اور اکیڈیمی مذکور کے زیر اہتمام یوم اقبال کے جلسہ میں آپ نے ایک نہایت پُراثر اور عارفانہ تقریر تعلیماتِ اقبال پر کی۔ اس تقریر کو جس نے بھی سُنا حد درجہ متاثر ہوا۔ چنانچہ ہم نے بھی سابقہ تاثرات کے تحت نیز اس جدید تاثر کی بنا پر **کانفرنس اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ** کے زیر اہتمام ۱۳ مئی اور ۱۶ مئی ۱۹۵۹ء کو ڈاکٹر صاحب موصوف کے سلسلۂ تقاریر کا اہتمام کیا۔ اور اسی ضمن میں **ایک تیسری** تقریر محترمہ بیگم شہاب الدین احمد صدیقی چیرمین گورننگ باڈی سرسید گرلس کالج کے دولت کدہ واقع ڈرگ روڈ پر ہوئی۔ اوّل الذکر دو جلسوں کے واسطے کانفرنس نے ایک ہزار دعوت نامے جاری کئے۔ وسیع و کشادہ پنڈال بنائے اور ان کی صدارت کے لیئے جناب **محمد شعیب صاحب وزیر خزانہ** اور جناب **حبیب الرحمٰن صاحب** وزیر تعلیم حکومتِ پاکستان کو زحمت دی۔ دونوں جلسوں میں کثیر التعداد اہل علم اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کی۔

تقریروں کا موضوع "اقبال کا نظریۂ تعلیم" تھا ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب نے کلام اقبال سے منتخب

---

[1] ماخوذ از قصیدۂ ہفت بند (قلمی) گزرانیدۂ محمد عالم بحضور حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیِ روہیلکھنڈ ([illegible]ھ) بعد واپسی از جنگ پانی پت (بریلوی)

اشعار اپنے مخصوص والہانہ انداز میں پڑھ کر نیز ان کی فصیح و بلیغ شرح کر کے ثابت کیا کہ:۔

"اقبال کا نظریۂ تعلیم تعلیمات اسلامی پر مبنی ہے۔ جن میں روحانی، دماغی اور جسمانی نشوونما کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو ذہنی انتشار پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب نے روحانی ترقی کی جانب سے بالکلیہ بے اعتنائی اختیار کر لی ہے اور اہلِ مشرق نے مذہبی اور روحانی نشوونما کے مقابلہ میں ذہنی نشوونما کو ہیچ سمجھ لیا ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ یک رخی ہی روحانی نشوونما اور مادی ترقی میں انتشار کا سبب ہے۔ یہی چیز آج دنیا کی قوموں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ اور برسرِ پیکار بنائے ہوئے ہے۔ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت بہم پہونچتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی سائنسی ترقی دراصل آغازِ اسلام کے اُن عالموں کی علمی سعی کی ممنون ہے جنہوں نے اپنے غور و فکر سے قوانینِ فطرت کا انکشاف کیا اور علم طب، سائنس، علم مابعد الطبیعیات اور دیگر علوم کے ابتدائی اصول و قوانین دریافت کئے اور ان کے علمی اطلاق سے دنیا کی موجودہ ترقی کی داغ بیل ڈالی۔ اور ساتھ ہی مذہبی اور اخلاقی اقدار کی بھی نگہداشت کی۔"

ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب نے دعویٰ کیا کہ:۔

"اقبال کی کوئی فکر اور اُس کا کوئی پیغام قرآن سے باہر نہیں ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ مغربی فلاسفر اور مفکرین کی اقبال نے خوشہ چینی کی صحیح نہیں ہے۔ اقبال کا فلسفہ اور نظریۂ تعلیم اسلامی اور خالص اسلامی ہے۔"

پہلی مئی کا پہلا جلسہ جس کی صدارت جناب محمد شعیب صاحب نے فرمائی اس میں مسٹر حسن علی عبدالرحمن بیرسٹر ایٹ لا آنریری جنرل سکریٹری کانفرنس نے صدر محترم کے اعزاز میں تقریرِ خیر مقدم کی۔ صدر محترم نے فاضل مقرر کی تعریف میں تعارفی تقریر فرمائی اور اختتام جلسہ پر جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی ایم اے ڈی لٹ، نائب صدر کانفرنس نے معزز مہمان اور صدر محترم کا منجانب کانفرنس شکریہ ادا کیا۔ جناب شعیب صاحب کے ہمراہ ڈائس پر مسٹر ایس۔ جی خالق قائم مقام ایجوکیشنل ایڈوائزر وجوائنٹ سکریٹری وزارتِ تعلیم تشریف فرما تھے۔ محترمہ بیگم شہاب الدین صدیقی، مسز سلمیٰ زمن پرنسپل سرسید گرلس کالج اور سیٹھ ایس۔ ایم یوسف صاحب ٹریژرر کانفرنس نے معزز مہمانوں کو ہار پہنائے سولہ مطبوعات کا نفرنس اکیڈیمی کا ایک سٹ بھی صدر جلسہ جناب شعیب صاحب کو مسٹر محمد عظیم الدین خاں سکریٹری سرسید گرلس کالج نے نذر گزرانا۔ جناب شعیب صاحب نے کانفرنس کی لائبریری، ریڈنگ روم اور اس کے میوزیم میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور ان کو ملاحظہ کر کے اظہار پسندیدگی فرمایا۔ آپ نے وزیٹرز بک

پر بھی دستخط فرمائے۔ آپ کے دستخط کا نمبر ۲۰۲۵۲ تھا۔

چونکہ ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب کا پہلا لکچر بہت مقبول ہوا تھا اور قلتِ وقت کے باعث سامعین کی سیری نہ ہوئی تھی اس لئے ۱۶ مئی کے دوسرے جلسہ میں حاضرین کی تعداد پہلے سے دوچند تھی۔ صدر جلسہ جناب حبیب الرحمٰن صاحب وزیر تعلیم کے علاوہ جناب ایس۔ایم۔شریف صاحب چیرمین ایجوکیشن کمیشن و سکریٹری وزارت تعلیم، جناب ایس جی خالق صاحب۔ جناب ڈاکٹر رفیع الدین صاحب۔ڈاکٹر شہید اللہ صاحب ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی صاحب، عبدالحق صاحب پریسیڈنٹ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن مشرقی پاکستان اور ڈاکٹر صورت علی صاحب پریسیڈنٹ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کراچی وغیرہ جیسے اکابر نے اپنی تشریف آوری سے جلسہ کی رونق میں اضافہ فرمایا۔

جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مولانا ماہر القادری ایڈیٹر فاران کراچی نے تلاوتِ قرآن پاک فرمائی۔ اس کے بعد راقم السطور نے منجانب کانفرنس جناب وزیر تعلیم کے اعزاز میں درجِ ذیل تقریر خیر مقدم بہ زبان انگریزی پڑھ کر سنائی۔

"آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے عہدیداروں اور ممبروں کی جانب سے آج آپ کا خیر مقدم کرنے کا فخر مجھے حاصل ہوا ہے۔ اس موقع پر ہمیں جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب کی تقریر سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی فاضلانہ قابلیت، عمیق تحقیقی کام اور علامہ اقبال کے فلسفہ کی صحیح ترجمانی ایسے امور ہیں جن کی بنا پر ان کی ذات کسی رسمی تعارف سے مستغنی ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے جو ۱۸۸۶ء میں سر سید علیہ الرحمۃ نے قایم کی تھی گزشتہ ۷۰ سال کے عرصہ میں ملتِ اسلامیہ کے بہترین عالموں کو اپنے پلیٹ فارم پر یکجا کر کے ملت کو ان کے افکار و آرا سے مستفید ہونے کا موقع بہم پہونچایا ہے۔ ہم اب بھی اپنی مجبوریوں کے باوجود اس روایت کے قایم رکھنے کی سعی میں مشغول ہیں اور آج کی مجلسِ علمی ہماری مخلصانہ کوششوں کی مظہر ہے۔

تقریباً دس سال سے ہم آپ کے کارناموں کو گہری دلچسپی کے ساتھ دیکھتے رہے ہیں جو آپنے ممالک غیر میں سفیر پاکستان کی حیثیت سے انجام دیئے ہیں۔ یہ امر کچھ کم فخر کا باعث نہیں ہے کہ آپ نے اٹلی کے زمانۂ سفارت میں روم اور نابس کی یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم جاری کرائی اور آپ ہی کی سعی سے اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" کا ترجمہ اطالوی زبان میں ہوا۔ اس وقت جو قلمدانِ وزارت آپ کے سپرد ہے وہ قومی تعمیر کے اہم صیغوں پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو ملک

کے علما اور علمی اداروں سے رابطہ قایم رکھنا ہوتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر بڑی طمانیت ہوتی ہے کہ آپ نے ان کی مربیانہ امداد فرما کر ان کی بہبودی میں اپنی گہری دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ علمی ادارے تعلیمی ثقافتی اور علمی بہبودی کے معاملات میں مفکرانہ اور معلوماتی اظہار رائے کا ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔ انہیں کی باہمی کوششوں سے ثقافتی ورثہ آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی خدمت ہی سب سے بڑی کسوٹی ہے علمی اداروں کے روشن خیال کارکن ہی سوسائٹی کے متعلق علمی نتائج کی صحیح اقدار معلوم کر سکتے ہیں۔ ایسے علمی اداروں کے ذریعہ وہ ان اصحاب کے ساتھ پورا تعاون کرنے کے اہل ہیں جو حکومت کی جانب سے اس قسم کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے ہیں۔ اور یہ سرکاری و غیر سرکاری اشتراکِ عمل علم کی نشر و اشاعت میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

تعمیری اور صحت مند اشتراک جو اس طرح علمی اداروں کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس معنی میں ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر سرکاری کوششیں یک طرفہ ہونے کی وجہ سے بے اثر ہو جائینگی۔ رضا کارانہ ادارے ثقافتی اور تعلیمی ترقی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں تعلیم اور علم بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔

غالباً اس امر کا اظہار ضروری نہ ہوگا کہ کانفرنس نے اس نصب العین کو اپنے دائرۂ کار میں تواتر کے ساتھ پیش نظر رکھا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ثقافتی اور تعلیمی جدو جہد کے ذریعہ پاکستان کو مضبوط بنانے میں حصہ لیا ہے۔ کانفرنس کی سالانہ روئدادیں ہماری مخلصانہ کوششوں اور ارادوں کا بیّن ثبوت ہیں۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ انشا اللہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہم اپنے آپ کو آپ کے اعتماد کا اہل ثابت کریں گے، ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ کی فیاضانہ امداد شامل حال رہی تو پاکستان کی تعلیمی ترقی و بہبودی میں سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی سرگرم حصہ ہوگا۔

آخر میں ہم ایک مرتبہ پھر اظہار تشکر کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست پر اپنا قیمتی وقت اس جلسہ کی صدارت پر صرف کیا۔ اور ہمیں یہ موقع بہم پہونچایا کہ ہم سب ڈاکٹر ظہیرالدین احمد صاحب جیسے عالم اور مفکر کے خیالات سے اقبال کے نظریۂ تعلیم کے متعلق مستفید ہوں۔"

تقریر خیر مقدم کے بعد عہدیداران کانفرنس مرزا علی اظہر صاحب برلاس، سیٹھ ایس ایم یوسف صاحب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، مولوی محمد عظیم الدین صاحب اور بیگم شہاب الدین احمد صدیقی صاحبہ نے جناب حبیب الرحمٰن صاحب، جناب ایس۔ ایم شریف صاحب اور جناب ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب کو

ہار پہنائے، اس کے بعد جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کی پر مغز تقریر ہوئی جس کا سلسلہ ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اس معرکتہ الآرا تقریر کے ختم ہونے پر جناب حبیب الرحمٰن صاحب وزیر تعلیم نے صدارتی تقریر ارشاد فرمائی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

"خواتین و حضرات!

منتظمین جلسہ کا شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے آج مجھے ڈاکٹر ظہیر الدین کی تقریر سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال ہمارے قومی شاعر تھے اور پاکستان کا تصور انہیں کی فراست کی پیداوار ہے۔ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ پر رکھی گئی تھی اور آج ہم اس موڑ پر پہونچ گئے ہیں جہاں ہمارا تعلیمی نظام اسی نظریہ کے تحت دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس وقت بڑی مسرت ہے کہ ڈاکٹر ایس۔ ایم شریف چیرمین قومی تعلیمی کمیشن اور بعض دوسرے ممبر بھی یہاں موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ فاضل مقرر کی تقریر کی اہم باتوں پر پوری توجہ کے ساتھ غور فرمائینگے ہمیں احساس ہے کہ مغرب میں مذہب سے بیگانگی اور مشرق میں سائنس سے بے اعتنائی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دُنیا کی تاریخ میں کوئی اہم مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس افراط و تفریط کے درمیان توازن قایم کریں۔

میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے ہمارے مالی ذرائع محدود ہیں۔ ہم تنہا تعلیم کے تمام مسئلوں کو حل نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہر شہری کے تعاون کی ضرورت ہے تاکہ حکومت ملک کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں معقول طور پر فراہم کر سکے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سے اس کام میں ہمیں مدد مل رہی ہے۔ ہم اس کے لئے کانفرنس کے اراکین کے بہت مشکور ہیں اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ہماری بہترین دعائیں کانفرنس کے ساتھ رہیں گی۔ میں آج کے لکچر کے واسطے کانفرنس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور آپ سب حضرات کا بھی شکر گزار ہوں"

عالیجناب وزیر تعلیم کے فرمودات کے بعد آخر میں جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس نے جو ہماری جماعت میں انگریزی کے بہترین مقررین میں سے ہیں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے میں جناب صدر کا اس لئے خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود یہاں آنے کے لئے وقت نکالا۔ آج کا دن خصوصیت سے اُن کی عدیم الفرصتی کا تھا۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آج عالمی بنک کے صدر مسٹر یوجین بلیک نہری

پانی کے تنازعے کو سلجھانے کیلئے کراچی آئے ہیں۔ اور گورنمنٹ پاکستان سے بہت اہم مذاکرات ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وزیر موصوف کا اس جلسہ کی صدارت کرنا اُن کے علمی ذوق و شوق کا بین ثبوت ہے

لائق مقرر ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب نے جن عالمانہ دلائل سے علامہ اقبال کی بلندیٔ فکر اور اُنکے اساس فلسفہ کو مبنی بر قرآن ثابت کیا ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا تر ہیں۔ اور تعریف کرنے کی اگر میں جسارت کروں تو وہ تحسین ناشناس ہوگی، لہٰذا میں ایسی غلطی کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا۔

آپ حضرات یعنی حاضرین جلسہ کا جہاں تک تعلق ہے ع

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعثِ صد افتخار ہے مگر آپ کا شکریہ میں اس لئے ادا نہیں کرتا کہ ایسے عالمانہ خطبے سُننے کے بعد انسان کی روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور ہر سامع اس امر کا متمنی رہتا ہے کہ کاش ایسے مواقع اُس کو بار بار ملتے رہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات بانیانِ جلسہ کے شکر گذار ہوں گے کہ اُنہوں نے جلسہ کو منعقد کر کے آپ کو موقع دیا کہ آپ اس سے استفادہ کرینگے

اختتام جلسہ کے بعد جناب حبیب الرحمٰن صاحب وزیر تعلیم نے دفتر کانفرنس اُس کی لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم کو بھی شرفِ معائنہ بخشا اور وزیٹرس بک پر اپنے معززہ دستخط ثبت فرمائے جن کا نمبر ۲۰۹۸۴ تھا۔

کانفرنس کے زیر اہتمام جلسوں کے بعد محترمہ بیگم شہاب الدین احمد صدیقی صاحبہ چیرمین سرسید گرلس کالج گورننگ باڈی نے جو اِن دونوں جلسوں میں از اول تا آخر شریک رہی تھیں جناب ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب سے خواہش کی کہ وہ ایک تقریر ان کے دولت خانہ پر بھی فرمائیں۔ چنانچہ یہ تقریر ۱۲ مئی کی شام کو ہوئی، یہ ایک مخصوص صحبت تھی جس میں پچاس ساٹھ اہلِ علم حضرات اور خواتین نے شرکت فرمائی۔ ابتداءً بیگم صاحبہ کی جانب سے پر تکلف دعوتِ عصرانہ موصوفہ کی خوش ذوقی و سلیقہ شعاری کا بہترین نمونہ تھی جلسہ کی کارروائی ہاؤسنگ سوسائٹی کے مشہور بانی و ناظم جناب امام احمد صاحب کی صدارت میں شروع ہوئی۔

حاضرین میں جناب جسٹس قدیر الدین صاحب، ان کی بیگم صاحبہ، لیڈی سر عبد الصمد خاں مرحوم (آف ریاست رامپور) کرنل رحمٰن صاحب اور بیگم کرنل رحمٰن، لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ صاحبہ۔ جہاں آرا بیگم صاحبہ۔ بیگم اکرام احمد۔ مسٹر انعام الرحیم ریٹائرڈ کمشنر۔ بیگم زینب عبد اللہ بیگم شوکت علی خاں۔ بیگم ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں۔ بیگم یوسف، بیگم تزئین فریدی اور مثل ان کے دیگر خواتین و حضرات موجود تھے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب نے حاضرین جلسہ میں خواتین کی اکثریت کے پیش نظر بزم سید
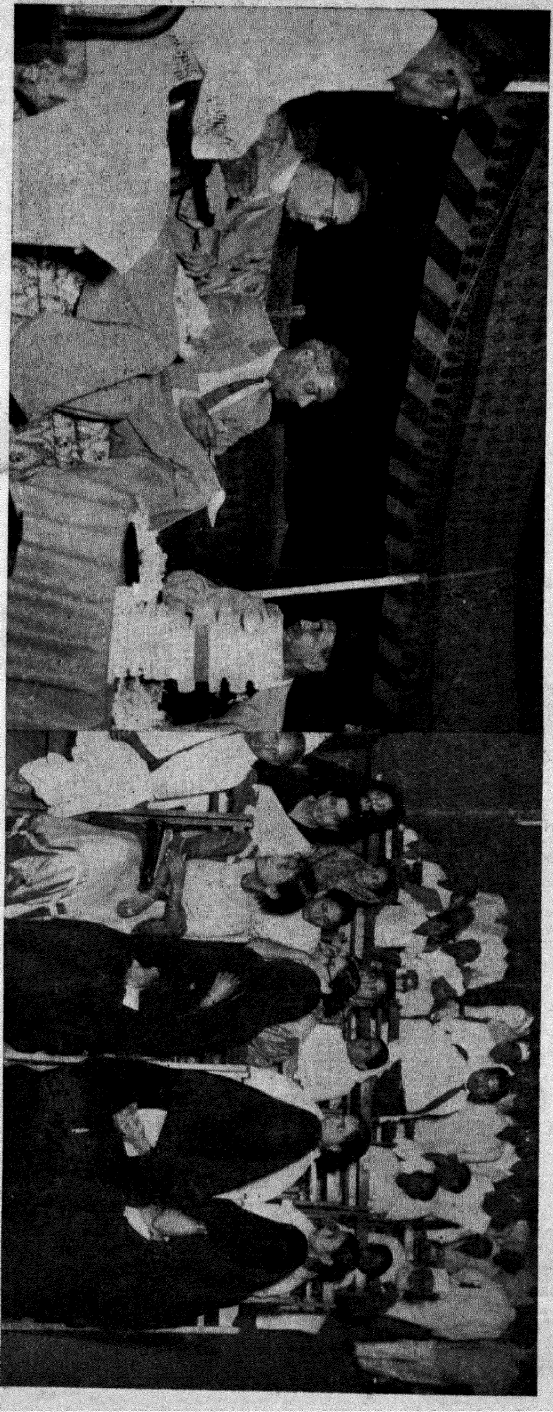
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ۴ مئی کے جلسہ کا ایک منظر .... جس میں ''اقبال کا نظریہ تعلیم'' پر ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب نے پہلی تقریر فرمائی ڈائس پر۔ دائیں سے بائیں ۔ (۱) ڈاکٹر جی ۔ ایم ۔ ڈی ۔ صوفی ۔ نائب صدر کانفرنس (۲) جناب محمد شعیب صاحب وزیر خزانہ ۔ صدر جلسہ (۳) مسٹر ایس ۔ جی ۔ خالق قایم مقام مشیر تعلیمات (۴) ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب ۔ سامنے میز پر کانفرنس اکیڈیمی کی مطبوعات رکھی ہوئی ہیں جو جناب شعیب صاحب کو نذر کی گئیں ۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ۴ مئی کے جلسہ کا ایک منظر .... جس میں ''اقبال کا نظریہ تعلیم'' پر ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب نے پہلی تقریر فرمائی ڈائس پر-دائیں سے بائیں - (۱) ڈاکٹر جی - ایم - ڈی - صوفی - نائب صدر کانفرنس (۲) جناب محمد شعیب صاحب وزیر خزانہ - صدر جلسہ (۳) مسٹر ایس - حی - خالق قایم مقام مشیر تعلیمات (۴) ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب - سامنے میز پر کانفرنس اکیڈیمی کی مطبوعات رکھی ہوئی ہیں جو جناب شعیب صاحب کو نذر کی گئیں۔

اظہر حسین رضوی ایم۔ اے (علیگ) کی خصوصی فرمائش کی بنا پر تعلیمات اقبال کے اس حصہ پر زیادہ زور دیا جس میں "عورت" کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں علامہ مرحوم کے چیدہ چیدہ اشعار اور ان کی دل آویز تشریح سے حاضرین کو حد درجہ محظوظ و متاثر کیا۔ یہ مفید صحبت قریب ۹ بجے شب تک جاری رہی۔ بیگم صاحبہ کے علاوہ جناب کرنل صدیقی صاحب کی تواضع، اخلاق اور انکسار بھی دیدنی اور قابل تعریف تھا۔

جناب ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب ۲؍ جون ۱۹۵۹ء کو بذریعہ ہوائی جہاز حیدر آباد واپس تشریف لے گئے۔ آپ کا یہ زمانۂ قیام گوناگوں علمی و روحانی صحبتوں کا حامل رہا۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر صاحب موعودہ تین ماہ کے عرصہ میں پھر پاکستان تشریف لائیں گے۔ وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ موصوف اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں فلسفہ و پیام اقبال پر بصیرت افروز تقریروں کا سلسلہ جاری کریں گے۔ ع

بہ سلامت روی و باز آئی

دارالعلوم شبیریہ:-

قیام پاکستان کے بعد کراچی کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور پرانے زمانہ کی قائم شدہ تعلیم گاہیں ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہوئیں تو متعدد تعلیمی جماعتوں نے میدان عمل میں آکر بکثرت درس گاہیں قایم کیں۔ اسی طرح کی ایک جماعت "اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی" ہے جس کے بانی اور صدر ہمارے محترم دوست مسٹر اے ایم قریشی ہیں، اس سوسائٹی اور اس کے اولوالعزم صدر کی سعی سے ۱۹۴۳ء میں اسلامیہ کالج قایم ہوا جس میں ابتدائً اکتیس ہی طلبا تھے اور اب ۱۹۵۹ء میں ترقی کے اس درجہ پر پہونچ گیا ہے کہ اس میں تین ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ اسی سوسائٹی کے تحت نرسری پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن کے ادارے بھی چل رہے ہیں۔ جن میں طلباء کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے۔ اتنے بڑے ادارے کے لئے عرصہ سے ایک بہت بڑی عمارت کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی لہذا ۱۹؍ مئی ۱۹۵۹ء کی شام کو اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم عالیجاب حبیب الرحمن صاحب وزیر تعلیم کے ہاتھوں ادا کرائی گئی۔ یہ بہت پررونق اور شاندار جلسہ تھا جس میں بیرونی ممالک کے سفراء، محکمہ تعلیم کے افسران اور معززین شہر مرد اور خواتین بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ میری کلا سو اسکول کی طالبات و طلبا نے رسم سلامی اور بینڈ کے ذریعہ بہت اچھا سماں پیدا کیا۔ آغاز جلسہ پر مسٹر اے۔ ایم قریشی نے ایک نہایت معلوماتی خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور مشہور مقنن مسٹر اے۔ کے۔ بروہی نائب صدر اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی نے ایک لاجواب تعارفی تقریر کی۔ مسٹر حبیب الرحمن وزیر تعلیم کی جوابی

نظریہ بھی سننے کے لائق تھی بالخصوص اُس کا وہ حصہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا جس میں انہوں نے بتایا کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد بھارت میں چار سو اکیاسی فسادات ہو چکے ہیں جن میں غریب مسلمان اقلیت پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ اس کے برعکس پاکستان میں گذشتہ آٹھ نو سال کے عرصہ میں ایک بھی ایسا بلوہ یا فساد نہیں ہوا۔ جس میں کسی ہندو کی جان و مال کا کوئی نقصان ہوا ہو۔ اور یہ تمام تر نتیجہ ہے "صلح کل" کے اُس تعلیمی نظریہ کا جو پاکستان کی تعلیم گاہوں میں پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

مجوزہ دار العلوم جس کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اُس کی تعمیر پر ایک کروڑ بارہ لاکھ اٹھاون ہزار پانچسو سینتالیس روپے صرف کرنے کا تخمینہ ہے تاکہ اُس میں پندرہ ہزار طلبا ہر قسم کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ عمارت بیات منزل کی مولانا محمد علی روڈ کراچی پر تمام اداروں کے لیئے یکجائی ہوگی۔

اس سلسلے میں ہمارا ناچیز مشورہ ہے کہ چھوٹے بچوں اور ثانوی تعلیم کے لڑکوں کی تعلیم گاہوں کا ایک ہی کمپاؤنڈ اور عمارت میں کالج کے ساتھ ہونا مناسب نہ ہوگا۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے مزار کے ساتھ ہی ساتھ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور کے مزار کی تعمیر کو بھی تعمیری اسکیم میں شامل کیا جائے جو اسی جگہ واقع ہے اور اب تک عالمِ کسمپرسی میں ہے ایک تیسری گزارش یہ ہے کہ افرادِ ملت کے حد درجہ افلاس اور ناداری کے پیشِ نظر دار العلوم کے تمام متعلقہ اداروں میں مصارفِ تعلیم کو کم سے کم کیا جائے۔ زمانۂ سلف میں تو اس قسم کی تعلیم گاہوں میں سرے سے طالبانِ علم سے کسی قسم کی کوئی فیس ہی نہیں لی جاتی تھی حتیٰ کہ قیام و طعام اور کتابیں وغیرہ بھی مفت مہیا کی جاتی تھیں۔ دار العلوم دیوبند اور مثل اُس کے دیگر مذہبی ادارے اس کی زندہ مثال ہیں۔

آخر میں ہم جناب اے۔ ایم۔ قریشی صاحب اور ان کے جملہ شرکائے کار کو خلوص دل سے ان کے اولوالعزمانہ اقدامات اور نیک ارادوں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور کامیابی و کامرانی کے لیئے ہماری دلی دعائیں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں گی۔

(سید الطاف علی بریلوی)

خودی

علامہ اقبالؒ

خودی روشن ز نورِ کبریائی است
رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش
وصالش از مقاماتِ جدائی است

چو قوے در گذشت از گفتگو ہا
ز خاکِ او بروید آرزو ہا
خودی از آرزو شمشیر گردد
دمِ او رنگ ہا بُرد ز بو ہا

طالبِ علم کی ڈائری

"چند تبصرے"

جناب ممتاز حسن صاحب
سکریٹری فنانس
گورنمنٹ آف پاکستان

سید الطاف علی بریلوی کی کتاب "طالب علم کی ڈائری" اسی مہینے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں چار مختلف موضوع ہیں۔ جو ایک حد تک ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ پہلے چار باب کا عنوان ہے "بھائیجان" اس میں سید صاحب نے اپنے والد مرحوم سید اسحاق علی صاحب جنہیں وہ بھائی جان کہکر پکارا کرتے تھے کی سیرت نگاری کی ہے اس میں مزاحی پہلو بھی ہے اور غیر مزاحی بھی مگر کہیں تکلّف یا آورد نام کو نہیں ہے سید صاحب نے بھائی جان کے خیالات۔ معمولات اور دوستوں، رشتہ داروں اور غیروں کے تعلقات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس سے بھائی جان کی شخصیت آنکھوں کے سامنے زندہ اور مجسم ہو جاتی ہے۔ اور وہ شخصیت کیا ہے ایک ایسی دلکش شخصیت جس سے خود بخود دوستی اور محبت کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے۔ شرافت۔ مروت۔ ہمت۔ عزّتِ نفس۔ یہ خصوصیات ایک گذرے ہوئے دَور کی یادگار ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اُس نسل کی تصویر ہے جب وہ انسانیت کے سارے اوصاف سے متصّف تھے۔ ان خصوصیات کی حفاظت کرنا اور اس پرانی نسل کی سیرت کی خوبیوں کو آئندہ نسلوں تک پہونچانا ہمارا فرض ہے۔ اور یہ خوشی اور اطمینان کا مقام ہے کہ سید صاحب نے بھائیجان کے کردار کی تصویر کھینچکر اُسے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ سید صاحب کی تحریر میں سادگی۔ روانی اور واقعیت ہے۔ کچھ موضوع کی دلچسپی اور کچھ ان کے انداز بیان کی دلکشی۔ غرض کہ بھائی جان۔ ایک بہت ہی جاذبِ توجہ کردار ہیں۔ اور چونکہ وہ کوئی افسانوی کردار نہیں ہیں ان کی اہمیت ادبی اور انسانی دونوں نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ ہے۔

بھائی جان کی سیرت نگاری چراغ حسن حسرت مرحوم کے "مردم دیدہ" اور رشید احمد صدیقی کے "گنجہائے گرانمایہ" کی یاد دلاتی ہے۔ "طالب علم کی ڈائری" "ایک کہانی" اور "بیلنس شیٹ" کی دلچسپی اس درجے کی تو نہیں جو بھائیجان کی ہے۔ مگر اس میں ان کہانیوں کا قصور نہیں۔ "بھائیجان" کچھ اور ہی چیز ہے۔ اگر یہ تینوں کہانیاں جو کہانیاں نہیں حقیقت ہیں "بھائیجان" سے الگ چھپتیں تو ان کی ادبی خوبیاں اور نکھرتیں۔ اب بھی ان میں سے ہر ایک قابل

ترجمہ ہے۔

سید صاحب کے قلم سے ٹھوس قسم کے علمی مضامین نکلتے رہتے ہیں مگر سیرت نگاری میں یہ پہلی کتاب ہے جو انھوں نے تصنیف فرمائی ہے۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً "العلم" میں چھپتے رہے ہیں سید صاحب نے انہیں جمع کرکے چھپوا دیا ہے جو ایک ادبی اور اخلاقی خدمت ہے۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

ڈاکٹر عترت حسین زبیری صاحب ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ایف۔آر۔ایس۔ایل

اپنے دوست سید الطاف علی بریلوی کی اس نہایت دلچسپ تصنیف "طالب علم کی ڈائری" پر یہ سطور لکھنے کی مجھے دلی مسرت ہے۔ سید صاحب نے گزشتہ تیس (۳) سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں گوناگوں اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے یہ طبع زاد مضامین ان کی سیرت کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں: مثلاً باریک بینی اور معاشرہ کے بدلتے ہوئے مزاج کا گہرا احساس نیز اُردو زبان کے محاورات پر ان کا کامل عبور۔

سید صاحب کے طرزِ نثر نگاری میں روزمرہ بول چال کی روانی و سلاست کے ساتھ قدما کی سی شستگی پائی جاتی ہے۔ جس کی مثال ہمارے عصری ادب میں مشکل سے ملے گی۔ آج کل ہمارے بعض نثر نویس اپنی نگارشات میں عبارت آرائی کے لئے عربی و فارسی کے ایسے غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہماری زبان میں غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کو کسی دوسرے اندازِ بیان پر قدرت نہیں ہوتی اس لئے اپنے ذوقِ عبارت آرائی کی تسکین کے لئے تمثیل و استعارہ کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تجریدی خیالات کو مادی صورت میں پیش کرنا ضروری ہے مگر میرے خیال میں ان کی یہ کوشش مفہوم کو واضح کرنے کے بجائے مبہم بنا دیتی ہے۔ بہرنوع نظم اور نثر دونوں اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ اگر نثر حدودِ استدلال سے باہر ہو اور تصورات و توہمات میں اُلجھ جائے تو بے محل معلوم ہونے لگتی ہے۔

سید الطاف علی کے اسلوب تحریر میں تخیلی حاشیہ آرائی نہیں ہے بلکہ اچھوتا انداز استدلال پایا جاتا ہے جو 'ایڈیسن' اور 'اسٹیل' کے انداز نگارش کو یاد دلاتا ہے ان کے پاؤں اس استوار زمین پر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ سماجی کیفیات کے نت نئے تغیرات اور ان کا باریک بیں مشاہدہ "بھائی جان" کی کردار نگاری میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نمایاں ہے اور اسلئے یہ کردار سماج کے مختلف النوع پہلوؤں اور اقدار کے لئے خلوص، محبت۔ اخلاقی جرأت۔ خیر سگالی اور بھائی چارہ کا ایک بلند معیار پیش کرتا ہے۔ باوجودیکہ "بھائی جان" ہماری تہذیب کا ایک مثالی کردار ہے لیکن وہ کسی نہج سے بھی اپنے اوپر جمود طاری نہیں ہونے دیتا بلکہ وہ وقت کے ساتھ متحرک نظر آتا ہے۔

سماجی تغیر کی زیر نظر تصویر فنی صلاحیت کے ساتھ ایجاز و بلاغت کی آئینہ دار ہے۔ طرزِ تحریر میں شوکتِ الفاظ کی نمائش نہیں بلکہ اس میں سادگی اور ایک طرح کا خاموش وقار پایا جاتا ہے۔ ان کے فن کا انتہائے کمال تصنع سے پاک ہونے میں مضمر ہے۔ فقروں کی ساخت

ہیں مقفیٰ اور مسجع بندشوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ اُنکی نثر میں تنوع بھی ہے اور تقابل بھی۔ معاشرہ کی عکاسی صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنا اس کی غیر معمولی خصوصیت ہے۔

باوجودیکہ کتاب میں قدم قدم پر ماضی کا استقلال حال کے اضطراب کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہے لیکن کسی جگہ امارت پرستی اور اس کی شان وشوکت کو نہیں سراہا گیا ہے۔ ان کا مشاہدہ متوسط طبقہ پر مرتکز ہے۔ سید صاحب کی نثر قنوط سے یکسر معرا ہے کیونکہ وہ روشن مستقبل میں مستقل یقین رکھتے ہیں اور یہ یقین ماضی کی اخلاقی اقدار اور سماجی خوبیوں سے وابستہ ہے اور یہی ہمارے معاشرہ کے اہم عناصر ہیں۔

"ایڈیسن" اور "اسٹیل" کی طرح سید الطاف علی گہرے اخلاقی احساس کے حامل ہیں اور اسی بنا پر اُنکی شدتِ احساس میں وہ اخلاقی اقدار موجود ہیں جن کے بغیر سماج کا صحیح تجزیہ اور بے لاگ نقد وتبصرہ ممکن نہیں جس کی واضح مثال ان کی "ایک کہانی" پیش کرتی ہے سید صاحب نے عمداً اپنی فکر کو مخصوص حدود میں متعین کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اندازِ نگارش میں ایک صوری اور معنوی امتزاج کمال فن کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کا موضوع اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ زندگی کی ہمہ گیر وسعتیں کیونکہ حیاتِ انسانی کے ڈراما میں غیب وشہود چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔

بابو جیارام سکسینہ صاحب ایم لے۔ ایڈوکیٹ۔ سابق ایم۔ ایل سی۔ بریلی۔

آپ کی یادآوری کا بہت بہت شکریہ۔ قلت وقت کے سبب میں نے ابھی تک آپ کی کتاب "طالب علم کی ڈائری" کو سرسری طور پر جہاں تہاں سے دیکھا ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ آپ نے اُردو زبان کے ممتاز ادیب کی حیثیت سے اپنی شہرت کو برقرار رکھا ہے۔ مسٹر ٹکیت رائے ایڈوکیٹ اور مسٹر مدنموہن بھٹناگر ایم۔ اے نے بھی آپ کی کتاب مجھ سے مستعار لے کر پڑھی۔

پنڈت رادھے شیام کتھاواچک بریلی

آپ کی بھیجی ہوئی کتاب "طالب علم کی ڈائری" مجھے ملی۔ پیکٹ کھولتے ہی اور آپ کا نام آنکھوں کے سامنے آتے ہی وہ زمانہ سر میں گھومنے لگا جب کہ بابو چھیل بہاری کپور وکیل زندہ تھے اور اُن کے ہمراہ کبھی کبھی آپ غریب خانہ پہ تشریف لاکر لٹریری بات چیت کرتے تھے۔

آپ اپنی اس پیاری کتاب کا مجھسے ریویو چاہتے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے مجھے کتاب بھیجی۔ اور پرانی ملاقات جو ذرا سی تھی اُس کو اتنا بڑا بنا دیا۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ "طالب کی ڈائری" میں ہر جگہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو آپ کو جاننا چاہتے ہیں وہ یہ ڈائری پڑھیں۔ بغیر ڈائری پڑھے ہوئے لوگ بھی آپ کو جاننے کے لئے یہ ڈائری پڑھیں۔ نام کو تو یہ ڈائری ہے لیکن پڑھنے میں اتنی دلچسپ ہے کہ ختم کرکے ہی ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔

جناب قدرت اللہ شہاب صاحب

میں نے اس دلکش کتاب کو ایک ہی نشست میں از اول تا آخر پڑھا اور اس سے بےحد لطف اندوز ہوا۔ آپ کے کلاسیکل اندازِ بیان کی

وجہ سے یہ ڈائری اس زمانہ کا واضح اور روشن موقع پیش کرتی ہے جس زمانہ کا اس میں ذکر ہے۔ "بھائی جان" کا کردار حقیقتاً حیرت انگیز ہے۔

جناب این۔ ایم خالق صاحب چیف کمشنر کراچی

طالب علم کی ڈائری ملی بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔ میں نے اس کتاب کو نہایت ذوق و شوق سے بعجلت تمام از اول تا آخر پڑھا۔ انداز بیان سادہ اور دلکش ہے۔ یہ انسانی کردار کی حالی دستاویز ہے۔ جن شخصیتوں کا اس کتاب میں خاکہ کھینچا گیا ہے ان میں سے بعض بہت ہی جاذبِ توجہ ہیں۔ اس میں اکثر سماجی برائیوں کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے اور جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ ہمارے جذبۂ ہمدردی کو ابھارتی ہے۔ سماجی برائیوں کا ذکر آپ نے جس پیرایہ میں کیا ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے کہ کسی جگہ بھی ناخوشگوار لہجہ کا عیب پیدا نہیں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب میں ہر پڑھنے والا اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پائیگا۔

انجمن اسلامیہ میگزین کراچی

کتاب ہذا پر جناب ڈاکٹر عشرت حسین صاحب بیری ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ ایل ایجوکیشنل ایڈوائزر گورنمنٹ آف پاکستان کا مقدمہ ہے جس میں موصوف نے اپنی تنقید نگاری کا بہترین مظاہرہ فرمایا ہے۔ مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جسمیں سب سے پہلے "بھائی جان" کے عنوان سے بریلوی صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے حالات لکھے ہیں اور جس عقیدت و محبت کے ساتھ لکھے ہیں وہ ایک بیٹے کو اپنے والد سے ہونا چاہیئے، اس کو پڑھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بریلوی صاحب واقعی اپنے والد بزرگوار کے ایک خلف صالح ہیں، خدا ہر ایک بیٹے کو یہ سعادت عطا فرمائے۔

اس کے بعد اصل "طالب علم کی ڈائری" شروع ہوتی ہے، جس میں جناب بریلوی نے اگست ۱۹۳۴ء تا دسمبر ۱۹۳۴ء کا اپنا روزنامچہ شایع فرمایا ہے، یہ حصہ نہ صرف اپنی سادگی اور اعتراف قصور کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ مصنف کے رجحاناتِ طبع، اخلاق و کردار کا ایک روشن آئینہ ہے، جس میں مصنف کی شخصیت اپنے باریک خدو خال کے ساتھ نمایاں ہوگئی ہے۔

اس کے بعد "ایک کہانی" کے عنوان سے نواب حافظ رحمت خاں کے ایک ماتحت جاگیردار کے خاندان کی ایک خاتون کا سچا واقعہ لکھا ہے جن کے باپ عسرت و تنگ حالی میں گھر چھوڑ کر دفعتاً غائب ہوگئے تھے اور جنہوں نے اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں بڑی مصیبت سے طے کیں، مگر بالآخر تعلیم کو تکمیل کی حد تک پہنچا کر اب یہاں کراچی کے کسی کالج میں لیکچرار ہیں۔ یہ کہانی بھی بہت موثر اور بصیرت افروز ہے۔

آخر میں "بیلنس شیٹ" کے عنوان سے ایک اور سچا واقعہ نقل کیا گیا ہے، جس سے ایک طرف تو خود جناب مصنف کے جذبۂ ایثار و ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے، دوسری طرف احسان فراموشی اور محسن کشی کی بدترین مثالیں پیش نظر ہوجاتی ہیں۔

کتاب کی زبان نہایت سادہ روزمرہ اور بےتکلف ہے، البتہ چند جگہوں پر خاص بریلی کے محاورے اور طرزِ ادا مصنف موصوف کے وطن کی یاد تازہ کردیتے ہیں۔

روزنامچے میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف جس بے تکلفی اور سادگی سے کیا گیا ہے وہ ایک خاص دلکشی اور اثر رکھتا ہے اور خود ستائی سے پاک ہے۔

مختصر یہ ہے کہ کتاب کا ہر حصہ مصنف کے کردار کی کچھ خاص خصوصیت پر روشنی ڈالتا ہے اور کتاب ختم کر چکنے پر قاری کے تحت الشعور جناب بریلوی کی ایک ایسی تصویر برآمد ہو کر تصور میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے جو خود موصوف کی ذاتِ گرامی کا حقیقی عکس معلوم ہوتی ہے۔

حضرت علامہ سیّد ابن حسن رضوی جارچوی

"طالب علم کی ڈائری" پڑھتے پڑھتے مجھے یونان کا ایک شہرۂ آفاق معبد یاد آ گیا۔ اپولو دیوتا کے معبد پر جہاں سے "ہاتف کی ندا" آتی تھی حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:-

"Know thyself"

(اپنے آپ کو پہچانو)

اپنے آپ کو پہچاننا بہت مشکل ہے۔ لوگ دوسروں کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔ غیر کے سوانح حیات پر نقد و تبصرہ کر کے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو پہچان کر، اپنے فضائل و معائب پر بے لاگ تبصرہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ غالب نے جو شاعر کے ساتھ ساتھ مفکر و فلسفی بھی تھے ہماری آسانی کے لئے ایک اور متبادل راستہ تجویز کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اس ڈگر پر چلنے والے ممکن ہے دنیا میں زیادہ ہوں۔ مگر پہلے راستے پر تو بہت کم لوگ گامزن ہیں۔

حضرت علی نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے:—

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

(جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا)

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ سید الطاف علی صاحب بریلوی اپنے رب کی معرفت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں مگر "طالب علم کی ڈائری" سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ہستی سے پورے طور پر آگاہ ہیں۔ جس سلجھے ہوئے انداز پر انہوں نے اپنی خوبیوں اور خامیوں کا مرقع کھینچا ہے۔ جس صاف، سلیس مگر دلکش عبارت میں انہوں نے "اپنے" اور اپنے خاندان کے حالات پیش کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے غیروں کی سوانح عمریاں لکھنا آسان ہے۔ مگر "آپ بیتی" لکھنا مشکل کام ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کو اپنی برائیاں نظر آتی ہوں کسی نے خوب کہا ہے ؎

اوروں کی بُری بات تو بھاتی نہیں تم کو
پر اپنی بُرائی نظر آتی نہیں تم کو

اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جن کو اپنی برائیاں بیان کرنے کی ہمت ہو۔

"طالب علم کی ڈائری" کے ساتھ ہی ساتھ میں ہندوستان کے ایک مشہور ادیب، خطیب اور سیاست داں کی "آپ بیتی" بھی پڑھ رہا تھا۔ اس کے مطالعہ سے یہ نظر آتا تھا کہ اللہ نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ میں سارے جہان کے مشاہیر اور دانشور ہیں اور دوسرے حصہ میں "صاحبِ کتاب" خود ہیں۔ پہلے گروہ کے لوگ

غلطیاں کرتے ہیں۔ فکر و نظر اور اقدام و عمل کے وقت ٹھوکریں کھاتے ہیں، مگر خود بدولت جو سوچتے ہیں یا جو کام کر بیٹھتے ہیں، وہ سَو فی صدی ٹھیک ہوتا ہے۔ گویا دوسرے لوگ سچ مچ انسان ہیں۔ کبھی غلطیاں کرتے ہیں۔ کبھی صحیح اقدام کرتے ہیں۔ مگر "صاحبِ کتاب" فرشتوں کی صف میں شامل ہیں، اِن سے زندگی بھر کبھی غلطی کا ارتکاب ہی نہیں ہوا۔

لیکن ہمارے سید الطاف علی بریلوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے انسانیت سے ماورا اور آدمیت سے بالا ہونے کا ادعا نہیں کیا۔ ان کی یہ کتاب آئینہ ہے جس میں انسان کے اصلی خد و خال نظر آتے ہیں۔ جن جن لوگوں کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ان کے اصل کردار کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سیّد صاحب کو اجرِ نیک عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو بھی مرقع کشی کرنے کی توفیق دے۔ آمین

ع مسائل کی فراوانی سے دُنیا دنگ ہے ساقی

(جناب واحد اجمیری)

عجب عقدہ کشا یہ دانشِ افرنگ ہے ساقی　　مسائل کی فراوانی سے دُنیا دنگ ہے ساقی

یہ دورِ عقل و دانش اور مصائب کی وہی شدت　　یہ کیا دانشوروں کی دانش و فرہنگ ہے ساقی

نہیں پینے پلانے سے بھی اب تو غم غلط ہوتا　　علاجِ دردِ سر شیشہ نہیں اب سنگ ہے ساقی

ہیں خود غرضی سے سب مصروف اک مزدور کی مانند　　یہاں پر خدمتِ خلق ایک عذرِ لنگ ہے ساقی

تمدن ارتقا کی آخری منزل پہ جا پہنچا　　مگر باقی ابھی تک فرقِ نسل و رنگ ہے ساقی

ہے دعویٰ سب کو انسانی تمناؤں کی حرمت کا　　مگر خونِ تمنا رنگ بر اورنگ ہے ساقی

کرے گی عظمتِ اخلاق کب مسحور دُنیا کو
یہ خواہش کس قدر واحد کی بے آہنگ ہے ساقی

چند تاثرات

(از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

ع پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

قدم قدم پر سود و زیاں ۔ سانحات و حادثات افکار و علائق حیاتِ انسانی سے اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو اس سے علٰحدہ کر دیا جائے تو زندگی کی کہانی ادھوری اور غیر مکمل رہ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ حالات کا تغیر و تبدل حزنیہ واقعات و مشاہدات کی یادوں پر ہلکا سا پردہ تو ڈال دے گا لیکن مٹنے نہیں دے گا۔ خیالات کی دُنیا انہیں سے آباد ہے اور قلم کی ساری جولانیاں انہیں کی رہینِ منت ہیں کسی المیہ کا وقوع پذیر ہونا باعثِ استعجاب نہیں۔ دُنیا حیرت تو اُس وقت کرے گی جبکہ دیکھ اور سُن کر اس کو فراموش کر دیا جائے ۔ چند مشاہدات عرض ہیں ۔ وقت سرعت سے اپنی منزلیں طے کر چکا اور کر رہا ہے لیکن ان کی یاد دماغ سے محو نہیں ہوتی۔

اگست ۱۹۵۰ء میں تقسیم ملک کو تین سال ہو چکے ہیں۔ لیکن سرزمینِ ہند ہم مسلمانوں کے لئے ماتم کدہ بنی ہوئی ہے ۔ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم بھی اپنے وطنِ مالوف سے وطنِ ثانی کے لئے مراجعت کر رہے ہیں ۔ بریلی سے ٹرین براہِ رامپور دلی آتی ہے ۔ رام پور کے اسٹیشن سے ایک صاحب عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہمارے ڈبہ میں داخل ہوئے ۔ جس قسم کے معاملات اس وقت درپیش ہیں ان میں کسی مسلمان کا سفر کرنا بڑا ہی صبر آزما اور پُر خطر کام ہے ۔ بہر حال ٹرین روانہ ہوتی ہے کئی اسٹیشن گزر جانے کے بعد یہ صاحب گھڑی دیکھتے ہیں ۔ نمازِ عصر کا وقت ہو چکا ہے ۔ یہ اُٹھتے ہیں اور کپڑا بچھا کر نماز شروع کر دیتے ہیں ۔ ہم سب حیران و ششدر ہیں ۔ سکھوں کی کرپان بند پارٹی ہے کہ قہر آلود نظروں سے ان کے حرکات و سکنات کو دیکھ رہی ہے اور یہ ہیں کہ ماحول سے بے پروا نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کے سامنے سربسجود ہیں ۔

اس وقت ایک مردِ مومن کی صحیح تصویر سامنے تھی ۔

فاکھہ کی سرحد ہماری آخری منزل تھی یہاں برصغیر پاک و ہند ممنوعہ اور غیر ممنوعہ دو علاقوں میں بٹ جاتا ہے۔

اس "دنیا کے" "اہل قضا و قدر" نے اپنے آپکو انسانیت سے اس درجہ معرا کر لیا ہے کہ ان کو انسان کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ اس جگہ سے جان و مال اور آبرو کا بچائے جانا بڑا ہی کٹھن مسئلہ ہے۔ سورج غروب ہو گیا ہے۔ رات کی سیاہی فضا پر محیط ہوتی جاتی ہے۔ سارا ماحول اُداس اور غمگین سا ہے۔ کیمپ زائرین سے خالی ہو چکے ہیں۔ میرے قریب ہی ایک بزرگ پریشان اور سراسیمہ سے ایک نوجوان لڑکی کے ہمراہ بیٹھے ہیں۔ خدا جانے کیا پیچیدگی پڑ گئی ہے کہ رات سر پر آگئی ہے اور ان کا سامان پاس نہیں ہوتا۔

اس وقت وہ جس حسرت زدہ نظروں سے سرحد عبور کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے وہ نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں میں ابھی تک پیوست ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ابتدا ہی سے یہ علاقہ اس معاملہ میں اپنا وقار کھو چکا ہے۔ خدایا وحشت و بربریت کا یہ دور کب تک دامنِ انسانیت کو تار تار کرتا رہیگا۔

سال گزشتہ سے پیوستہ کراچی میں ایک بین الاقوامی نمائش ہوئی۔ اس وقت موسم سرما ہے۔ میں نے ایک روز واپس ہوتے ہوئے جو روح فرسا منظر دیکھا اس کی یاد اب بھی جب کبھی آجاتی ہے دل و دماغ اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ رات سرد اور تاریک ہے۔ شاہراہ سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ لوگ کھڑے ہوئے ڈھکیلوں پر کوئی چیز اِس طرح سے رکھ رہے ہیں جیسے باربرداری کا سامان ہو۔ لیکن جب قریب سے گزرے تو معلوم ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ باربرداری مال کی نہیں انسان نما حیوانوں کی ہو رہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ نمائش کے شروع ہونے کے وقت سے اختتام تک مفلوج اور معذور مرد، بچوں اور عورتوں کو کافی تعداد میں ان کا ٹھیکیدار سڑک کے کنارے جگہ جگہ ڈلوا دیتا ہے اور رات کو انہیں اٹھوا کر ان سے پیسہ پیسہ لے لیتا ہے۔ برہنہ جسم بے رونق آنکھیں، زرد چہرے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں، رنگ برنگ کی آوازیں نکالتے رہنے کی وجہ سے حلق اس طرح خشک ہو گئے ہیں کہ آواز تک نہیں نکلتی ہے۔

میں نے ان کی خاموش نگاہوں میں مظلومی و بیچارگی کی پوری داستان پڑھ لی۔

نئے انقلاب کے بعد گداگری کا پیشہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ معذور لوگوں کے لئے غریب گھر بھی کھولے گئے ہیں۔ لیکن وہ ابھی ضرورت سے کم ہیں کیونکہ ایک اندازہ کے مطابق صرف کراچی میں ناکارہ لوگوں کی تعداد کئی لاکھ کے قریب ہے چنانچہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے بھیک کے بجائے

کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا ہے جس سے نان جویں کا سامان ہو سکے۔ بندر روڈ سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک نابینا شخص چند چیزوں کا ایک چھوٹا سا خوانچہ لگائے بیٹھا ہے۔ فروختگی کا کام ایک کم سن بچے کے سپرد ہے۔ وہ ہر ایک آنے جانے والے سے بصند ہے۔ منتیں کر رہا ہے کہ کچھ اس سے بھی خرید لیا جائے۔ لیکن قیمتی سامان سے بھری پُری دوکانوں کے سامنے اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے جو کوئی خریدے۔ یہی عمل مجھ پر بھی دوہرایا گیا۔ میں نے بچے کو سمجھایا کہ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس پر نابینا گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔ کئی دن ہو گئے ایک پیسے کی بکری نہیں ہوئی۔ اپنے کو سنبھال بھی لیں تو بچوں کی بھوک کا کیا علاج کریں۔ ہم سب پہلے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔

معلوم نہیں ان سماجی ناسوروں اور زخموں کے مندمل ہونے میں ابھی کس قدر وقت اور لگے گا۔

جگیوں کی دُنیا کی بے سروسامانیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔

ایک شکستہ سی جگی کے سامنے کچھ بچے زمین پر بیٹھے کھیل رہے ہیں۔ بال بڑھے ہوئے۔ گندے چہرے جسم ایسے سوکھے ہوئے جیسے ہڈیوں کے پنجرے۔ جن چیتھڑوں سے ان کی ستر پوشی کی گئی ہے وہ موسم کی سختی کے لئے قطعًا ناکافی ہیں۔

میں سوچ رہی ہوں آئندہ چل کر یہ بچے پاکستان کی تعمیر میں کس قسم کا پارٹ ادا کریں گے۔ کیا مستقبل قریب کے ان معماروں کے ہاتھوں اس کی شاندار ترقی کا نام پایۂ تکمیل کو پہونچ سکے گا؟

"مکاشفاتِ کشفی"

(جناب جوش ملیح آبادی کی نظر میں)

رباعی جسم کے کس بل پر اکڑنے والی، بے اندیشہ جوانی کے بس کا روگ نہیں، یہ تو ناتوانی کی موجوں پہ بہنے والی اندیشہ سنج پیری کے قابو میں آنے والی صنف ہے۔

رباعی میں یوں تو سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ چوکھٹا بنا ہے تفکر کی تصویر کے واسطے۔ اور اسی وجہ سے شاید جس وقت کہ شاعر انتہائی شیریں اور انتہائی تلخ جوانی کے کیف آور و کرب انگیز طوفان سے نکل کر مشاق اور خوش فکر پیری کے حدود میں داخل ہوتا ہے۔ اور وسیع و پیچیدہ مسائل کو اختصار و اتحاد کے ساتھ چار مصرعوں میں بند کر لینے کی اپنے میں قابلیت پاتا ہے تو رباعی کی جانب مڑ جاتا ہے۔

لیکن اس صورتِ حال سے اس نظریئے کی تغلیط نہیں ہوتی کہ ہر شاعر بلا استثناء ایسا ہی عمل کرتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

آصف علی مرحوم کا خط ایک دوست کے نام

چونکہ اس خط میں میرا بھی ذکر تھا مکتوب الیہ نے وصول ہوتے ہی مجھے بھیجدیا تھا۔ آج کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں اتفاق سے نکل آیا ہے۔ یہ خط اُس وقت کا ہے جب مسٹر آصف علی اُڑیسہ کی گورنری سے سوئٹزرلینڈ کی سفارت پر جارہے تھے۔ عجیب و غریب خط ہے۔ کسی گورنر کسی سفیر اور کسی وزیر کو موت کا اتنا خیال۔ جاہ و حشمت کی بے ثباتی کا ایسا احساس! ــــ اور زبان کس قدر پیاری ہے۔ زمانہ جام بہ دست و جنازہ بر دوش است" لکھ کر تو پیشین گوئی کردی تھی کہ بس دنوں اور مہینوں کا حساب باقی ہے۔ (واحدی)

گورنمنٹ ہاؤس۔ پوری

۲۳ مئی ۱۹۵۲ء

برادر عزیز، شاد آباد رہو،

خط پہونچ گیا۔ نہ قدم قلم ہوئے نہ قلم مگر زندگی کے بہت سے دن قلم ہی نہیں ہوئے بلکہ قلمزد ہوگئے۔ جو کچھ باقی ہیں اُن کا شمار کون جانے۔ جو سانس آتا ہے پیامِ عدم لے کر آتا ہے۔

میں نے تمہیں "پرچھائیں" بھجوائی تھی مگر اسکی رسید تک نہیں آئی۔ تو ظاہر ہے کہ پڑھنے کی نوبت کہاں آئی ہوگی۔

کیا قمر کی شادی ہوگئی؟ یا پرچھائیں کے پیچھے والہ و شیفتہ ہیں۔ چلو دولتکدہ کا سرانجام ہوگیا مبارک ہو۔ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں گھر بنا۔ جہے ہم تو جس گھر میں نال گڑا تھا وہ تو اب میونسپل کمیٹی نے بچیوں کا مدرسہ بنادیا۔ اور ہم بفضلہٖ تعالےٰ موجِ دریا کی طرح خانہ بدوش ہیں۔ آج یہاں۔ کل وہاں۔ اور جہاں جاتے ہیں گھر ساتھ لے جاتے ہیں۔ بہت سی عمر کٹ چکی یہ جو رہ گئی ہے وہ بھی کسی طرح کٹ جائے گی۔

یہاں کبھی منعم خاں خان خاناں کا دَور دَورہ تھا چند برس ہمارے بھی کٹ گئے۔ اب ۷ جون کو یہاں سے کوچ ہے۔ غالباً اگلی ۷ کو سوئٹزرلینڈ میں مقام ہوگا۔ غالباً زندگی کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ بہر کیف خدا کا ہر حال میں شکر ہے۔ "زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است"

تین چار ہزار شعر پچھلے دَورِ نظر بندی میں کہے تھے نہ کوئی سُننے والا باقی رہا اور نہ چھاپنے والے کی خوشامد کو ہم تیار۔ لہٰذا اپنی دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولےٰ۔ ایک دو جو سننے اور سمجھنے والے ہیں اُن کا اصرار تھا کہ یہ طبع ہو جائیں مگر "تو بزمانہ بساز" کا فلسفہ یہاں ہمیشہ گراں بلکہ ناقابلِ ہضم رہا۔ انگریزی اُردو کا نثر و نظم کا مجموعہ چند

جلدوں کے برابر ہے۔ مگر اب تک صرف یہاں چار برس میں جو تقریریں کی تھیں ان کی دو جلدیں کوئی پانچسو صفحے سے زیادہ کی چھپی ہیں۔ اب وہ بھی ناپید ہو جائینگی ہوسکا تو بھجواؤں گا۔

اچھا خیر خوش رہو۔ اور اور سب اقربا و احبا بھی۔ پرسندگان حال کو واجب۔ بہن کو بہت بہت دعا وسلام۔ تم کو دعا۔ کبھی کسی نے عطا کی خبر نہیں لکھی کیا حال ہے کہاں ہیں؟

داعدی صاحب کا نظام المشائخ جو ابھی تک مرحوم دلی کی وضعداری نبھائے جاتا ہے ضرور آثار رہتا ہے اور اس سے کچھ جھلملاتا ہوا خاکہ "ساجی" زندگی کا ضرور سامنے آجاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ ایک درویش کی جگہ ایک گلیم میں باقی ہے۔ ورنہ بظاہر اس دور میں تو دو خویشوں کی جگہ بھی ایک اقلیم بھر میں دو بھر معلوم ہوتی ہے اور مجھے خود پر تعجب ہو رہا ہے کہ چار برس اڈیانے کے بعد بھی چار سطریں اس زبان میں لکھنے میں چنداں ناکام نہیں رہا۔ خدا حافظ ——— آصف

(بسلسلۂ صفحہ ۱۹)

مکاشفاتِ کشفی

لاکھوں شاعر ایسے گزر چکے ہیں کہ بوڑھے ہو کر مر گئے لیکن زندگی میں کبھی ایک رباعی بھی کہی ہی نہیں، اور اسی اسی۔ نوے نوے برس کی عمر میں بھی ناپختہ کار نوجوانوں کے مانند "خیالِ زلفِ جاناں کب ہمارے دِل سے نکلے گا" کی بے وقت راگنی الاپتے رہے۔ یہ مزاجوں کے اختلاف کی بات ہے۔

بعض شاعر رومانی ہوتے ہیں بعض مفکر۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ بعض شاعر مفکر زیادہ ہوتے ہیں۔ اور رومانی کم۔ اور بعض رومانی زیادہ ہوتے ہیں اور مفکر کم۔ رومانی شاعروں کی تعداد مفکر شاعروں کے بالمقابل ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اس لئے کہ قدرت "ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند" کے ماتحت مفکر مغنیوں یعنی فلسفی شعرا کے پیدا کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتی ہے اور رومانی یعنی جنسی شعرا کو جو عشقِ مجازی عشقِ حقیقی اور عشقِ روایتی سے کھیلتے رہتے ہیں بہت بڑی تعداد میں پیدا کر کے درمیانی طبقے کی تفریح کا ساز و برگ مہیا کرتی رہتی ہے۔

اس موقع پر اس حقیقت کی جانب اشارہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ قدرت کی یہ اک سنتِ جاریہ ہے کہ ہر حکیم شاعر نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقی شاعری کے معنی میں ہر شاعر حکیم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا امر کی توضیح اس خیال سے مناسب نہیں کہ اگر میں ایسا کروں گا تو ہزاروں "خیالِ زلفِ جاناں کب ہمارے دل سے نکلے گا" الاپنے والے میرے گرد و پیش جمع ہو کر مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں گے بہرحال اس وقت تو کشفی صاحب کی رباعیوں کے باب میں اظہارِ خیال کرنا ہے دوسری باتوں سے کیا کام؟

"نفسیاتی علاج"

(از جناب سید ضامن حسین نقوی گویا جہان آبادی)

انسانی زندگی کے دو رُخ ہیں، حیاتِ شاعرہ اور غیر شاعرہ۔ حیاتِ شاعرہ سے مُراد وہ زندگی ہے جس کے اعمالِ ارادی کا شعور ہمیں براہِ راست ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا چلنا پھرنا، غور و فکر، کلام و سکوت غرض کہ ارادی عمل، جملہ اعمالِ بالقصد ہماری حیاتِ شاعرہ ہی کے اجزا ہیں۔ حیاتِ غیر شاعرہ سے مراد ہماری وہ زندگی ہے جس کے افعال کا نہ ہم کو براہِ راست علم ہوتا ہے نہ ہمارے ارادے کے ماتحت اُن کا صدور ہوتا ہے۔ اس قسم میں، دورانِ خون، تغذیہ و تنمیہ، دفعِ فضول اور بدلِ ماتحلل کی تمام جبلتیں داخل ہیں۔ اعمالِ حیاتِ شاعرہ کا مرکز، ہمارا ذہن یا نفس ہے اور افعالِ حیاتِ غیرشاعرہ کا مرکز طبیعت یعنی طبیعت محرکِ افعالِ غیرارادی ہے اور نفس یا ذہن محرکِ اعمالِ ارادی، یہ ہے ہماری زندگی کا مجموعی نظام۔

اس نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام میں، ذہن کا اثر مادۂ جسمانی پر پڑتا ہے اور مادۂ جسمانی کا ذہن و نفس پر۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ہم کوئی غمناک خبر سنتے ہیں تو چہرہ زرد ہوجاتا ہے نبض کی رفتار سست یا غیر معمولی تیز اور ضعیف ہوجاتی ہے اور آنکھوں سے بعض اوقات آنسو جاری ہوجاتے ہیں برخلاف اس کے جب کوئی خوشخبری سُنتے ہیں تو صرف چہرے ہی سے نہیں، آنکھوں اور نگاہوں سے مسرت کی شعاعیں پھوٹ نکلتی ہیں، مغموم اور شاد انسانوں کے چہرے اپنی اندرونی کیفیات کا آئینہ، اپنے اپنے جذبات کی جُدا جُدا تصویریں ہوتے ہیں۔ یہ کھلا ثبوت اس امر کا ہے کہ ذہن سے جسم یا مادہ جسمانی متاثر ہوتا ہے اسی طرح ذہن بھی کیفیاتِ جسمانی سے متاثر ہوتا ہے۔ شدتِ مرض اور تکلیف میں، ذہن مختل اور انسان پریشان حواس اور بعض اوقات دیوانہ ہوکر کپڑے پھاڑنے لگتا ہے۔ سر پھوڑنے لگتا ہے۔

بہرحال یہ مسلم ہے کہ ذہن سے جسم یا مادہ اور تمام کیفیاتِ جسمانی سے ذہن متاثر ہوتا ہے اس دوطرفہ تاثیر و تاثر کے نظام پر نظر ڈالنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نفسِ انسانی اور جسمِ انسانی اپنی ماہیت کے اعتبار سے دو ایسے نقیض ہیں جن میں کسی نسبتِ باہمی کا امکان ہی نہیں، اس لئے کہ اجتماعِ نقیضین تو محالِ عقلی بھی ہے اور محالِ عادی بھی تو اس صورت میں نفس اور مادہ کے باہمی ارتباط کے کیا معنیٰ ہیں، نفس غیر مادی اجسم

تمامتر مادی ایک دوسرے کے نقیض جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، پھر ہم اس نقطۂ نظر کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ نظامِ حیات میں ایک دوسرے کا ہر وقت اثر قبول کرتا ہے۔

لا محالہ ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ نفس اور مادّہ کو ایک دوسرے کا نقیض سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک ہی حقیقت ہے جس کا حیاتِ شاعرہ میں ظہور بصورت نفس و ذہن انسانی ہے اور غیر شاعرہ میں، بصورتِ طبیعت اور نفس و مادہ دونوں ہی اُسی حقیقتِ واحدہ کے مظاہر ہیں۔ نفسِ انسانی اُس کا مرکزِ اجمالِ شعوری ہے اور مادّہ مرکزِ افعالِ غیر شعوری۔ اس سے زیادہ ارتباط نفس و ذہن کی تشریح یہاں غیر ضروری ہے[۱]۔

ہمیں کہنا یہ ہے کہ جب ہم نظامِ حیات یہی پاتے ہیں کہ نفس و مادہ یا ذہن و جسم ایک دوسرے کا اپنے اشتراکِ ماہیت کی وجہ سے اثر قبول کرتے ہیں تو ہم کو معالجات میں بھی صرف جسم و کیفیاتِ جسمانی یا طبیعت و مزاج ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھنا چاہیئے نفس و ذہن انسانی کا بھی لحاظ لازمی ہے۔ علاج کا مقصد تو مدافعت امراض ہے۔ لیکن مرض کسے کہتے ہیں؟ صحت کا مفہوم سمجھ لیجئے مرض کے معنی خود بخود سمجھ میں آجائیں گے "صحت" تمام اعمال و افعالِ حیات کا مطابق مطالبہ نفس و مادہ یا ذہن و جسمانیت بغیر کسی مزاحمت کے اجرا ہے۔ مثلاً آنکھ، نظامِ حیات میں، نظر کے لئے ہے جو ذہن انسانی کے اشارہ یا ارادہ سے اپنا کام انجام دیتی ہے۔ اب اگر اس کے نظام میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہوجائے جو خلاف نظام ہو تو وہی عارضی خرابی، مرض ہے تمام عوارض جو خلاف نظام صحت ہوتے ہیں، عارضی مزاحمتیں ہی ہوتے ہیں۔ انہیں عارضی مزاحمتوں کے دور کرنے کی کوشش کا نام معالجہ ہے۔ علاج کا مقصود یہی ہے کہ نظامِ حیات کو اس کی صحت مندانہ صورت کی طرف واپس لایا جائے اور ان عارضی نقائص کو دور کردیا جائے جو مخل نظامِ صحت ہوں۔ اور اصل صورت علاج یہ ہے کہ انسان کی اندرونی قوت مدافعت کو مدد دی جائے۔ لیکن قوتِ مدافعت، طبیعت ہی کا حصہ نہیں، نفس انسانی کی قوت طبیعت کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم ہے آپ کسی معمولی مریض کو اُس کی موت کا پورا یقین دلا دیجئے پھر آپ چاہے اسے کتنا ہی اکسیرِ حیات کا استعمال کرائیں یا جواہر مہرہ کھلائیں مگر کچھ نتیجہ نہ ہوگا۔ انتہائی وحشت زدہ ہوکر آدمی کیوں مرجاتا ہے صرف اسی وجہ سے تو کہ پہلے اس کی نفس کی قوتِ مدافعت ساقط ہوجاتی ہے نبض کا سقوط تو بعد کو ہوتا ہے۔ یورپ کے کسی شہر میں ڈاکٹروں نے کسی ایسے مجرم کو جس کو سزائے موت کا حکم عدالت سے مل چکا تھا، نفسیاتی تجربات کے لئے اپنے معمل میں لے لیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے سے پہلے اُسے بتایا کہ وہ اس کے جسم سے اس کا تمام خون نکال کر اُسے مار ڈالیں گے۔ پھر اسے آپریشن کی میز پر لٹا کر اسکے پاؤں میں ایک سوئی چبھوئی اور اس مقام سے نیم گرم

[۱] طالبان تشریح فلسفہ نفس ملاحظہ فرمائیں جس میں تمام ماہیتِ افعالِ نفس ہی سے بحث کی گئی ہو۔

پانی اس طرح ڈالا کہ اس کا قطرہ بیں گرتا وہ شخص اپنے کان سے
سُن رہا تھا اور اُسے یقین ہو رہا تھا کہ اس کے جسم کا خون گر
رہا ہے تھوڑے ہی دیر میں اُس کی نبض سُست ہونے لگی
اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ یہ کیا تھا؟ نفس کی
قوتِ مدافعت کا تعطل یا سقوط اس قسم کے تجربات کا دوسرا
پہلو یہ ہے کہ اگر کسی مایوس مریض کی نفسی قوتِ مدافعت
کو قوی کر دیا جائے اور اس میں اس یقین کی روح پھونکدی
جائے کہ وہ انشاء اللہ ضرور اچھا ہو جائے گا تو کوئی وجہ
نہیں کہ اس یقین کا کوئی اثر اس کے عوارضِ جسمانی پر نہ
پڑے مگر شرط یہی ہے کہ یقین دلانے والے کو کوئی موثر دم
علیٰ حاصل ہو یعنی کم از کم اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر
مریضوں کے لئے تشفی بخش ہو ورنہ اُس کا خود صاحبِ یقین
کامل ہونا تو یقین کامل پیدا کرنے کے لئے لازمی طور پر
موثر ہوگا۔

مبتلائے مرض ہونے سے پہلے صحت کو برقرار رکھنے
کے لئے، آب و ہوا۔ مناسب غذا، معتدل حرکت و سکون
ضرور کارآمد ہیں مگر اس ستہ ضروری میں جس شئے کو
نظر انداز کر دیا گیا ہے یا ناقابلِ توجہ سمجھا گیا ہے یعنی
معالجین اس کو کما حقہٗ اہمیت نہیں دیتے وہ ایک نہایت
مقدم عنصرِ حیات کی فروگذاشت ہے۔ میرا مطلب تحفظِ
قوتِ نفس سے ہے۔ نفسِ انسانی، اچھی غذاؤں عیش
و راحت، نسیمِ خوش گوار کے جھونکوں اور پھولوں کی
مہکوں یا ساغر و مینا کے دور سے قوی نہیں ہوتا ہے۔
تمام وہ کام جن کے صدور سے ہماری روح میں مسرت
کی قدرتی لہر دوڑ جاتی ہے ان کے صدور سے نفسِ انسانی
قوت حاصل کرتا ہے اگر ایسے کام ہماری زندگی بن جائیں تو
ہماری انسانی زندگی مدافعت امراض اور سببِ امراض
تو بہت معمولی باتیں ہیں آتشِ نمرود کو گلزار بنا سکتی ہے
اس حقیقت کو آپ شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھئے جن لوگوں کی
قوتِ نفس قوی ہوتی ہے ان کے حیرت انگیز اور معتبر کارنامے
عرصہ تک عجائبات تاریخ ہو کر، کراماتوں کے نام سے
زبان زدِ خلائق رہتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک اونچا مقام
نفسِ انسانی اور اُس کی قوت کی بلندی کا ہے۔ معمولی
طور پر بھی قوتِ نفس کا برقرار رہنا مقابلۂ امراض کے
لئے نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے۔ یہاں یہ
کہدینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ارتکاب معاصی سے جو مسلسل
جاری ہے مجرموں میں اطمینانِ دل باقی نہیں رہتا اور
یہ بے اطمینانی کھلی ہوئی علامت ضعفِ نفس کی ہوتی ہے۔

معالجات کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ بقراط سے پہلے صرف یونان ہی میں نہیں۔ مصر وغیرہ میں
بھی علاجِ امراض جھاڑ پھونک ہی سے کیا جاتا تھا۔
جھاڑ پھونک کی روح عامل کی قوتِ نفس ہوتی تھی جو
مریض کی قوتِ مدافعت نفس کو بڑھا دیتی تھی اور اس طرح
بعض اوقات بہت سے لاعلاج مرضوں کا علاج ہوجاتا
تھا۔ مُردوں کو زندہ کرنے کی کچھ روایتیں آپنے ضرور
سُنی ہوں گی اگر ان کو آپ ہر مقام پر صحیح نہ سمجھیں تو
اتنا تو ضرور ماننا ہوگا کہ مُردہ دلوں کا زندہ کر دینا تو
کسی طرح خلافِ قانونِ فطرت نہیں کہا جا سکتا اور جب
کسی شخص کا دل کسی کی ایک نظر میں زندہ ہو سکتا ہے
تو تنِ بے جان میں جان آنا بھی ایک سلسلہ ہی کی بات ہے

یعنی کوئی غیر مسلسل امر نہیں۔

قوتِ نفس کی جان یقینِ محکم ہے اسی یقینِ محکم سے وہ شے پیدا ہوتی ہے جس کو صوفیائے کرام ہمت کہتے ہیں ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

غرضکہ معالجات کے دورِ اول میں، تمام تر علاج بالنفس ہی تھا اور کامیابی بقدرِ ہمت تھی مگر بقراط کے زمانے سے کچھ اس کے ساتھ جڑی بوٹیوں کا استعمال بھی شروع ہوا پھر رفتہ رفتہ علاج بالنفس کم ہوتا گیا اس لئے کہ اس قسم کے معالج کم ہوتے گئے کہ جن کی نگاہیں جادو کا کام کرتی تھیں تو دواؤں کا استعمال بڑھتا گیا یہاں تک کہ جالینوس نے طبیعات ہی کے نقطۂ نظر سے فنِ طب کو مدون کیا اور علاج بالنفس کے لئے اس طب میں کوئی جگہ نہ رکھی۔ حالانکہ حفظِ صحت اور دفعِ امراض میں مریض کی قوتِ نفس کو بڑا دخل ہے۔ شرحِ اسبابِ امراض کو محض مادیات کے دائرہ میں محدود کر دینا ایک بڑے اہم جزو کے نقصان کو نظر انداز کر دینا تھا اور اس فراموشی کا خاص سبب یہی ہے کہ جالینوس اور اس کے اصول علاج کی پیروی کرنے والوں نے نفسِ انسانی کا صحیح مقام پہچانا نہیں اور کچھ ان میں ایسے بھی ہوئے جو نفسِ انسانی کا کوئی وجود ہی غیر طبیعت کے نہیں مانتے پھر وہ طبیعات کی چہار دیواری سے کس طرح قدم آگے بڑھا سکتے تھے۔

آج بھی علاج کے جو طریقے جاری ہیں وہ تمام تر علاج بالادویہ ہی ہیں طریقِ علاج بالمثل (ہومیو پیتھک)، بالضد (ایلوپیتھک) طبِ یونانی، آیورویدک، علاج شمسی، بائیو کیمک، سب میں، امراض جسمانی کا علاج کم و بیش مادیات ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہ راز ہر جگہ نظر انداز ہے کہ جسم پر ذہنِ انسانی یا نفسِ انسانی کا بھی اس حد تک اثر ہو سکتا ہے کہ انسان ایک بات میں اپنی جان دے دیتا ہے۔ دل کی ہمت جواہر مہروں سے نہیں بڑھتی ہے اس کا علاج یقینِ محکم ہے بسلسلۂ امراض کا جو طریقہ صوفیائے کرام میں تھا وہ در اصل مریضوں میں یقین کی روح پھونک دینا ہی تھا۔ حاصل یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ دواؤں کے ذریعہ سے علاج ترک کر دیا جائے یقیناً جسم موثراتِ جسمی کا بھی اثر لیتا ہے مگر نفسی تاثرات بھی کچھ ہوتے ہیں۔ یورپ کے ماہرین نفسیات نے جو نفسیاتی تجربات بعض معالجات کے سلسلہ میں کئے ہیں اُن سے وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ تمام امراض کے ازالہ میں مریض کی نفسی قوتِ مدافعت کو فروغ دینا ضروری ہے اور ناامیدی اور یاس کو اُمید کامل سے بدل دینا لازمی ہے۔ مالیخولیا اور اسی طرح کے دوسرے دماغی اور ذہنی عارضوں میں تو نفسیاتی علاج بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔

دفعِ امراض کی کوشش سے پہلے حفظِ صحت نہایت ضروری ہے، لیکن حفظِ صحت کے لئے ایک صحت مند آب و ہوا و غذا و ماحول ہی صرف ضروری نہیں زندگی کے وہ طریقے بھی برتنا لازمی ہیں جن سے انسان کا دل قوی ہوتا ہے اور ان تمام طریقوں کا ماحصل یقینِ محکم اور پاکیزہ اخلاق و اعمالِ حسنہ ہیں اور اعمالِ حسنہ کی جان، دردِ خلائق اور دردمندوں کی امداد ہے۔ میرے ایک مکرم دوست عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ تھے انہوں نے اپنا یہ ایک واقعہ مجھ سے خود بیان کیا

کہ جب کسی دماغی رگ کے پھٹ جانے سے سیروں خون ان کے جسم سے نکل گیا اور کسی طرح بند نہ ہوتا تھا اور ان پر بے حد ضعف طاری ہوگیا تو اُنہوں نے بہت سے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں ضعیفوں اور دردمندوں کی دلی دُعائیں اپنی بے دریغ امداد سے حاصل کیں، وہ کہتے تھے کہ جتنی تیری دلی خوشی میں ان کی مدد سے اضافہ ہوتا جاتا تھا اتنی ہی میری طبیعت مرض پر غالب ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ بہت جلد تندرست ہوگئے۔

اب ہم ایک حدیث پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں اور وہ حدیث ہے۔ لا یرد القضا الا الدعا یعنی قضا کا کوئی علاج نہیں لیکن دُعا۔ دُعا کے دو پہلو ہیں خود اپنی وہ دُعا جو مکمل یقین ہو اور دوسروں کی وہ دُعائیں جن سے کسی مریض کا یقین زندہ ہو۔ یہ طریق علاج اتنا آسان ہے کہ جس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا مگر اس دورِ مادیات میں تمام روحانی قدریں چونکہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہیں اس لئے یقین و بقین دہانی کی کسی صورت کا بھی اعتبار نظروں میں نہیں ہے۔ آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ علاج بالنفس یا نفسیاتی علاج کا مفہوم میری نظر میں اوہام و خرافات جادو ٹونے نہیں، صرف مجھے یہ بتانا تھا کہ نظامِ حیات میں نفسِ انسانی کا ایسا اہم مقام ہے کہ جسکو بھلا دینا خود کو بھلا دینا ہے اور خود کو بھول جانے کے بعد چاہے کوئی انسان بظاہر عیش و طرب کی ہولوں میں سرخ و سپید ہو جائے مگر صحیح معنوں میں تندرست نہیں ہوتا۔ تندرست وہی ہے جس کا من درست ہی جو بہر حال ایک اطمینان کی وجہ اپنے دل میں موجود پاتا ہے۔

مکاشفاتِ کشفی

(بسلسلہ صفحہ ۲۱)

کشفی صاحب کا شیب حسب دستور رباعیات کی جانب مڑا ہے۔ کشفی صاحب کا مزاج حکیمانہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ رباعی کی طرف کیوں آئے؟ بات یہ ہے کہ کشفی صاحب کی رگوں میں چونکہ کشمیر اور لکھنؤ کا خون ہے۔ اور اس بنا پر ان کی ذہانت شرابِ دوآتشہ کے مانند مواج ہے۔ اس ذہانت کے ساتھ وہ اک نمایاں تعلیم یافتہ بزرگ ہیں۔ اور اس ذہانت و علم کے دوش بدوش چونکہ وہ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ اور چونکہ تصوف جذباتی و جمالی نقطۂ نظر سے اک دلفریب ذہنی مشغلہ ہے۔ اور شریعت کے سنگین قلعہ سے طریقت کے رنگین محل کی جانب اک نغمہ خیز اور رقص آمیز جست ہے۔ اور چونکہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ و برائے رباعی گفتن خوب تر است۔ اور چونکہ تصوف کے پر اسرار کارخانہ کی مشین اس قدر باریک کاتتی ہے کہ اس کی کتاوت پر بعض اوقات حکیمانہ دقیقہ سنجی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ اس لئے ان بہت سے ذہین اور جذباتی انسانوں کی طرح جو دل و دماغ پر ترجیح دیتے ہیں کشفی صاحب بھی تصوف کی جانب جھک پڑے اور رباعیاں کہنے لگے۔

دام ہر رنگ زمیں بود

بات یہ ہے کہ خالص فلسفے کی جانب جو راستہ جاتا ہے عین اس کے موڑ پر تصوف نے اپنی خانقاہ تعمیر کی ہے۔ اور

(باقی صفحہ پر)

فکری تاریخ میں مسلمانوں کا مقام

از جناب سید محمد تقی صاحب ایڈیٹر جنگ

انسان کی مجموعی فکری تاریخ میں مسلمانوں کا کیا درجہ ہے اور مسلم مفکرین نے انسانی فکر کے ارتقا میں کیا خدمات و مساعی انجام دی ہیں یہ سوال ابھی تک تشنۂ بحث ہے اور تا حال اس موضوع پر وہ توجہ مبذول نہیں کی گئی جس کا یہ مستحق ہے۔ یوروپی مستشرقین اور اہل قلم نے جو اس نوع کے سوال اُٹھانے کے طبعاً عادی ہیں اپنے نہج پر اس سوال کا بھی جواب دے لیا ہے۔ پروفیسر گلوم اور آرنلڈ نے اپنی کتاب "اسلام کا ورثہ" میں اسی قسم کے سوال کا جواب دیا ہے۔ لیکن گلوم اور آرنلڈ اور اُن جیسے دوسرے مستشرقین کا طرز فکر یہ ہے کہ وہ جدید تمدنی ارتقاء کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور پھر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس تمدنی ارتقا میں مختلف تہذیبوں اور تمدنوں نے کیا حصہ لیا ہے۔ "اسلام کا ورثہ" کتاب میں بھی یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے نئی فکر کے کن مبادی کو استوار کر لیا تھا اور ان کا مقام فکر جدید کے معیار سے کتنا فروتر ہے۔ مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن پر HISTORY OF THE ARABS کے مصنف مسٹر فلپ کے ہٹی کے خیال میں عرب تمدن کی عظمت کے بڑے شیدائی ہیں اور بیروت یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالطیف طیباوی مصنف "تصوف اسلامی عربی" کے بیان کے مطابق غزالی کے سب سے بڑے شارح اور عالم ہیں عرب تمدن کو جو بڑے سے بڑا درجہ دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ عربوں کو یونان کا خوشہ چین خیال کرتے ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے اپنی کتاب۔ عربوں کی علمی تاریخ میں یونانی تمدن کو آفتاب اور مسلم تہذیب کو ایک ایسے چاند سے تشبیہ دی ہے جس نے یونانی آفتاب علم سے اکتساب نور کر کے یوروپی عہد عظمت کو منور کیا۔

نکلسن کی یہ تشبیہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو۔ مگر اس میں یونانیوں کی فکری خدمات اور عربوں کے نظری اکتشافات سے دردانگیز ناواقفیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ خود ہٹی نے بھی اس غلطی کو مانا ہے اور اپنے ایک تازہ ترین مضمون میں لکھا ہے کہ ابھی عربوں کے تمدنی ارتقا کا مقام متعین کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ عربوں سے متعلق اب تک جتنی تحقیقات ہوئی ہے وہ قطعی ناقص ہے اور ابھی بہت کچھ نئے اکتشافات ہونے باقی ہیں۔

مشرق کے ساتھ عموماً اور عربوں کے ساتھ خصوصاً سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا ہے کہ ان کی خدمات کو ان پیمانوں سے ناپ لیا جاتا ہے جو یوروپی مفکرین کی اکثریت نے اپنے لیے متعین کیے ہیں۔ حالانکہ ہر تمدن کو اس کی اپنی

ثقافتی قدروں کے ماتحت ناپنا چاہیئے۔ دوسروں کی اقدار کے ماتحت نہیں یا پھر ایسی ثقافتی اقدار معلوم کرنی چاہئیں جو تمام تمدنوں میں مشترک ہوں اور جن کو اساس قرار دے کر فکر کے مختلف درجے اور تمدن کے مختلف مراحل بنائے جا سکیں۔

انسانی تاریخ کی یہ مشترکہ ثقافتی اقدار کون سی ہو سکتی ہیں ان پر تو یہاں بحث ممکن نہیں مگر پروفیسر اے۔ ڈی رشی کے بقول جنہوں نے اپنی کتاب "تہذیب علم اور مذہب" میں اس سوال پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اتنی بات بہرحال طے ہے کہ انسانی تہذیب مادی اسباب راحت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس فکری و نظری سرمایہ سے جو کوئی قوم جمع کرتی ہے۔ جدید مادی اور سائنٹفک تہذیب کے سب سے بڑے نقیب ایلڈس ہکسلی ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف "بہادر نئی دنیا" میں جدید سائنٹفک تمدن کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے خیال میں سب کچھ سائنس ہے۔ انہیں کی طرح کمیونسٹ اہل قلم مارکس، اینگلز، بخارن۔ لینن، لاڈین، ہارلس برڈلا۔ وغیرہ۔ اس دنیا کے خالص مادی یا معاشی تقاضوں سے اوپر اٹھنا نہیں چاہتے مگر وہ بھی انسانی فکر کو تہذیب کا ایک بنیادی عنصر قرار دینے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔

دراصل کسی تہذیب و تمدن کا اندازہ اور اس کے معیار ارتقا کا تعین اس کے مادی ساز و سامان سے نہیں بلکہ اس کے فکری و نظری سرمایہ سے کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کسی ثقافت نے ان بنیادی فکری مباحث کے سلسلہ میں کیا خدمات انجام دی ہیں جو انسان کے سامنے لاکھوں سال کے تاریخی اور ناتاریخی عہد میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

عربوں کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ وہ مسائل کو دو حصوں میں بانٹتے تھے۔ بعض مسائل وہ ہیں جو اساسی اور دوامی اہمیت رکھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنکی اہمیت وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی ہے۔ اور اس لئے ان کی طرف نسبتاً کم توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔

شیخ ابو علی سینا نے جو مسلمانوں کی فکری تحریک کا رہنما ہے اس سلسلہ میں بڑی دلچسپ تقسیم کی ہے۔ شیخ نے اپنی تصنیف "منطق المشرقین" میں ذکر العلوم کے عنوان سے جو بحث کی ہے اس میں علوم کی تقسیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"علوم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور انکے حصول کی خواہشیں مختلف ہوتی ہیں لیکن ان علوم کی تقسیم بالکل ابتدائی تقسیم" دو حصوں پر ہے۔"

شیخ نے آگے چل کر انتہائی عالمانہ انداز میں تمام انسانوں کی عام فکری تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ :۔

"کچھ علوم ایسے ہوتے ہیں جن کے اصول تمام تاریخ پر منطبق نہیں ہوتے بلکہ وقت کے ایک محدود دور تک چل کر ختم ہو جاتے ہیں یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے ایک مدت تک ان اصولوں کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے اور آگے چل کر وہ معلوم

کرلئے جاتے ہیں"۔

گویا اب سے ہزار سال پہلے شیخ نے جدید سائنسی علوم کے پیدا ہونے کی بالواسطہ پیشین گوئی کردی تھی اور اسی کے ساتھ اپنی اور عرب مفکرین کی طرف سے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس قسم کے علوم کی بابت ان کا رویّہ کیا ہے۔ شیخ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ :-

"علوم کی دوسری قسم وہ ہے جس کی نسبت ہر زمانے کے ساتھ یکساں رہتی ہے۔ یہی وہ علوم ہیں جنہیں حکمت کہنا زیادہ مناسب ہے اور انہیں کو اصل اور اساس کہنا چاہیئے"

شیخ اور اس کے ساتھی مذکورہ علوم کی تحصیل کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ منطق اسی قسم کے علوم میں شامل ہے اس لئے مسلم مفکرین منطق کے حصول اور تکمیل کو اول درجہ پر رکھتے ہیں منطق کا موضوع بحث "فکر" ہے اس لئے مسلمانوں کی خاص توجہ "فکر" کی اصلاح اور تہذیب کی طرف مبذول ہوتی ہے۔

مسلم مفکرین کو منطق کے علاوہ فلسفہ مابعدالطبیعات سے دلچسپی ہے اس لئے کہ فلسفہ مابعدالطبیعیات میں ہی فکر کو اپنی پوری جولانیاں دکھلانے کا موقع ملتا ہے۔ مسلم عہد کا فلسفہ مابعدالطبیعیات کچھ ایسے مسائل سے بحث کرتا ہے جن کی اہمیت ہر عہد میں یکساں طور پر برقرار رہیگی مثلاً علت و معلول وحدت و کثرت اور کلی و جزئی کی بحثیں۔ یہ بحثیں خمپا بزی یعنی ڈارون کے بندر نما انسان کے عہد سے لے کر آج تک اپنی یکساں اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

آج بھی جب کہ انسان ایٹم کو توڑ کر الیکٹران و پروٹان کی مخفی توانائی سے دست و گریباں ہے۔ علت و معلول کی بحث اپنی سابقہ اہمیت کے ساتھ جاری ہے۔ پروفیسر جیمس جینس اور ان کے ساتھی نظریہ کوانٹم اور دوسرے برقی و مقناطیسی تجربات سے استدلال کر کے یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ علت و معلول کا سابقہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور ان کے مقابل ماسکو کی اکیڈیمی آف سائنسز کے ارکان علت و معلول کے پرانے رشتہ کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ یہ بحث ٹھیک اسی قسم کی ہے جیسی امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب تھافتہ الفلاسفہ اور ابن رشد نے اپنے جواب تھافت التھافت میں چھیڑی تھی انداز نظر اور طرز استدلال کا فرق تو ضرور ہے مگر بحث کا ماحصل ایک ہی ہے یعنی یہ کہ علت و معلول کا ہمہ گیر اصول تمام کائنات پر حاوی ہے یا نہیں۔

بہرحال مسلمان مفکرین ان بنیادی مباحث اور اس نوع کے اساسی علوم سے دلچسپی لیتے تھے اور اگر انہوں نے ان اساسی سوالوں کے حل کرنے اور انسانی فکر کی ترقی میں کوئی مدد دی ہے تو ان کا ثقافتی درجہ یقیناً بہت بلند ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا صحیح درجہ متعین کرنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہم ان کے خالص فکری معیار کا جائزہ لیں۔ ہم یہ پرکھیں کہ خالص فکری بحثوں میں وہ کس منزل میں تھے اور آیا ان کے فکری سرمایہ سے عہدِ جدید کا انسان کچھ فائدہ اُٹھا سکتا ہے یا نہیں۔

مسلمانوں کا فکری درجہ کس قدر بلند تھا اور انہوں نے خالص فکر کے میدان میں کتنا شاندار ورثہ چھوڑا ہے۔ افسوس ہے یہ موضوع ابھی تک اچھوتا ہے اور اس پر یا تو سطحی النظری سے بحث کی گئی ہے یا متعصبانہ انداز میں۔ ممتاز مستشرق ایچ۔ ٹی۔ سورلی کے خیال میں جس نے سندھ کے مشہور فلسفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف مرحوم پر سب سے زیادہ مستند کتاب شاہ عبداللطیف آف بھٹ کے نام سے لکھی ہے مسلمانوں کا فکری سرمایہ غالباً صرف اتنا ہے کہ عربی اسکولوں کے طلباء لفظی بحثیں کرنے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں باقی عقلی اعتبار سے وہ محض کورے رہتے ہیں یا پھر پروفیسر برٹرینڈ رسل کے خیال میں عرب یونان کے ناکام نقال سے زیادہ درجہ نہیں رکھتے لیکن ظاہر ہے کہ ایک ایسے تمدن کو اس سرسری انداز میں نظر انداز کر دینا جس نے ابن سینا جیسے جینس پیدا کئے ہوں۔ جو این۔ ایم۔ رائے کے بقول آج بھی ہوتا تو صفِ اول کے مفکرین میں جگہ پاتا۔ جس میں البیرونی جیسا سائنس داں بھی موجود ہو جو ہٹی کے خیال میں تمام انسانی تاریخ کے عظیم سائنس دانوں میں سے ایک تھا۔ تاریخی جسارت کی دردناک مثال ہے پھر کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں میں سینا اور البیرونی جیسے کتنے مفکر موجود تھے واقعہ یہ ہے مسلم عہد کے ساتھ بہت بڑی علمی بے رحمی کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ کماحقہ مطالعہ کئے بغیر محض چند مشابہتیں دیکھ کر اس پر رائے قایم کر دی گئی ہے حالانکہ ایک ایسے تمدن کی بابت جس نے مفکرین کی اتنی بڑی جماعت پیدا کی ہو جو کسی بھی ترقی یافتہ تمدن کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے یوں سرسری رائے نہیں دی جا سکتی۔ ضرورت یہ تھی کہ ہم حقائق کو ذرا زیادہ گہرائیوں میں اتر کر ٹٹولتے ان کا جائزہ لیتے ان کے اسباب و وجوہ کو پرکھتے اور پھر کوئی فیصلہ کرتے لیکن ایسا نہیں کیا جاتا اور صرف معمولی غور کے بعد فیصلے دے دیئے جاتے ہیں۔

دیکھنا یہ چاہیئے کہ بغداد و قرطبہ میں جب نہ سائنسی طرز استدلال تھا نہ اضافیت و کوانٹم کے نظریئے کیوں ایسے ذہن مفکر پیدا ہوئے جو خالص فکر کے پیلانے پر آئن انیٹائن کی سی دقت نظر اور رسل کی سی منطقی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں جبکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک صرف منطقی سوجھ بوجھ کا تعلق ہے وہ رسل سے بھی کچھ زیادہ پختہ ہیں گو وقت نظر اور عام معلومات میں رسل سے انہیں کوئی نسبت نہ ہو لیکن جہاں تک فکر خالص کا تعلق ہے وہ رسل کیا تاریخ کے بڑے سے بڑے مفکروں سے ٹکر کھاتے ہیں بلکہ ان کے پیشرو نظر آتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں اور یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کے جواب پر اس سوال کا جواب بھی منحصر ہے۔ جو ہم نے شروع میں اٹھایا تھا۔ یعنی یہ کہ انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا کیا فکری مقام ہے اس لئے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مسلم عہد میں اتنے مفکروں کے پیدا ہونے کے اسباب کیا تھے تو اس سے یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ کہ مسلمانوں کا تاریخ میں فکری مقام کیا تھا۔

مسلمانوں کے عہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے خاص توجہ منطق و فلسفہ کی طرف مبذول کی ہزار سال کے طول طویل عرصہ میں جس قدر مسلم مفکر

منطق کی تدوین فکری قوانین کے تجزیہ اور فلسفہ منطق کے مضبوط اور منظم قوانین بنانے میں منہمک رہے۔ چنانچہ آج بھی منطق و فلسفہ میں عربوں کا کوئی مثیل و نظیر نہیں نظر آتا۔ عربی کی منطق کا جدید منطق سے توازن کیجئے عرب فلسفہ کو عہد ڈیکارٹ سے لے کر آج تک کے فلسفہ کے مقابل رکھیئے تو آپ بآسانی محسوس کریں گے کہ منطق و فلسفہ میں عربوں کا مقام کیا تھا۔

عربوں کے یہاں پختگی۔ بالغ نظری اور قوانین فکر کا اتباع نظر آتا ہے۔ عربوں کی خاص توجہ منطق کی اس قسم کی طرف مبذول رہی ہے جسے استدلالی منطق کہتے ہیں اس لیئے کہ اس کے قوانین مستحکم اور مربوط ہیں مل اور اسپنسر کی استقرائی منطق کو انہوں نے ثانوی اہمیت دی اس لئے کہ اس کے قوانین غیر مستحکم اور غیر منظم ہیں۔ یہی استدلالی منطق عربوں کی خاص منطق ہے اور اس صنف میں وہ آج تک سب کے سب پیشرو ہیں اور چونکہ ہزار سالہ مساعی کے بعد انہوں نے اس منطق کو تکمیل کے اعلےٰ مدارج تک پہنچا دیا ہے اس لئے اسمیں کسی بنیادی تبدیلی کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔

فلسفہ قدیم ہو یا جدید اور اس پر استدلالی انداز میں بحث کی جائے یا استقرائی طرز پر بہر حال ساری بحث کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ علم حاصل کس طرح ہوتا ہے علمیات یا EPY ISTEM OLOGY کی یہ بحث ہی سائنس اور فلسفہ کی سب سے زیادہ بنیادی اور اساسی بحث ہے اور اسی نقطۂ نظر سے تمام فلسفیانہ اور سائنسی نظریئے پیدا ہوئے ہیں۔ آئن اینسٹائن نے اس مقام پر لکھا ہے کہ تمام سائنس کا مقصد یہ ہے کہ وہ تجربات میں ربط پیدا کرے اور انہیں ایک منطقی نظام میں مربوط کرے۔

و یا تجربہ ایک خارجی حقیقت ہے جو بیرونی دنیا سے ذہن کو حاصل ہوتا ہے اور ذہن اسے منطقی نظام میں مربوط کرتا ہے۔ اسی چیز کو عربوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ :۔

"اَلْعِلْمُ هُوَ حُصُوْلُ صُوْرَةِ الشَّیْءِ فِی الذِّهْنِ"

یعنی علم کسی چیز کے انسانی ذہن میں حاصل ہونے کا نام ہے۔

جدید فلسفہ میں بحث یہ چھڑی ہے کہ علم کی اس تعریف میں تجربہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے یا اس ذہن کو جس میں یہ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ برلین یونیورسٹی کے فلسفہ طبیعات کے پروفیسر ہنس رائش باچ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ایٹم اور عالم کون" میں لکھا ہے کہ :۔

فلسفہ نے ہمیشہ دو بنیادی چیزوں کو جُدا جُدا رکھ کر دیکھا ہے۔ ایک تجربیت کو اور دوسرے تصوریت کو۔"

پروفیسر رائش باچ کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ میں ہمیشہ یہ بنیادی بحث رہی ہے کہ اصل حقیقت خارجی دُنیا کو حاصل ہے یا انسانی ذہن کو لیکن انہوں نے اس جملہ میں "ہمیشہ" کا لفظ غلط استعمال کیا اس لئے کہ عربوں نے ان دونوں چیزوں کو کبھی جُدا نہیں کیا بلکہ ان کو ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں بتایا چنانچہ وہ صورت شئے کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی انسانی ذہن کو بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وہ اس نسبت کو بھی پوری اہمیت دیتے ہیں۔ جو ان دونوں حقیقتوں یعنی صورت شئے اور ذہن

کے درمیان پائی جاتی ہے۔

پروفیسر رائش باچ نے اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ:-

آج کے فلسفۂ طبیعیات نے ان دونوں حقیقتوں کو جدا کرنے سے انکار کردیا ہے"

گویا آج کی طبیعیات نے وہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے جو عربوں کا تھا۔

حصول علم سے متعلق اس بنیادی بحث کو طے کرکے عرب مفکر دوسری سب سے اہم بحث چھیڑتے ہیں اور یہی وہ بحث ہے جہاں وہ دوسروں سے امتیازی حیثیت حاصل کرلیتے ہیں۔ آئین اینسٹائن نے کہا ہے کہ سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ تجربات کو ایک منطقی نظام میں مربوط کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ منطقی نظام کیا ہے اور اس منطقی نظام میں ربط پیدا کرنے کا کیا مفہوم ہے اس کا جواب کیمبرج یونیورسٹی کے (Pure Mathematics) یعنی ریاضیات نظری کے پروفیسر ڈاکٹر ای۔ ڈبلیو۔ ہابسن نے اپنی کتاب "علم طبیعیات کا دائرہ بحث" میں یہ دیا ہے کہ:-

"سائنس فکر کے جس علاقہ اور دائرہ سے بحث کرتی ہے اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ انتہائی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اس کی درجہ بندی بھی کرے کہ اسے عام قوانین کے ماتحت بھی لائے"

بہ الفاظ دیگر منطقی نظام کا مطلب فکر کی درجہ بندی کرنا اور اسے عام قوانین کے ماتحت لانا ہے۔ یہی سائنس کا مقصد ہے اور اسی کو وہ انجام دیتی ہے۔

یونان میں یہ کام ارسطو نے منطق کے نام سے شروع کیا تھا جسے عربوں نے خوب پڑھا اور پھیلا کر ایک منظم جامع اور مانع علم بنادیا۔ جدید سائنس نے منطق کو نظرانداز کرکے فکر کی درجہ بندی اور قوانین فکر کی تنظیم کا کام اپنے طرز پر شروع کیا اور یہ فرض ریاضیات نظری کے سپرد کردیا چنانچہ وہی آج یہ فرض بھی انجام دے رہی ہے۔ ریاضیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ ساری کائنات انھیں ریاضی قوانین پر عمل پیرا ہے اور خدا سب سے بڑا ریاضی داں ہے۔ عربوں نے اسی کام کو منطق سے لیا تھا۔ اور ان کے خیال میں خدا منطق کے قوانین کا سب سے زیادہ احترام کرتا ہے اور ساری کائنات انہیں قوانین کے ماتحت حرکت کرتی ہے۔ گویا کام دونوں کا ایک اور نتائج دونوں کے یکساں ہیں۔ ہاں تسلسل فکری اور استدلال کی مربوطی میں فرق ہے۔

عربوں نے منطق کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے کہ منطق وہ آلہ ہے جس کے قوانین کی رعایت انسانی فکر کو غلطی اور خطا سے محفوظ رکھتی ہے اس لئے کہ وہ فکر کو استوار کرتی ہے اور دنیا کا ہر علم فکر ہی سے تعلق رکھتا ہے گویا عربوں کا واحد موضوع فکر کی اصلاح ہے جس کی پاکیزگی اور صحت کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دینے ہی کی وجہ سے اتنے اچھے مفکر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے جو آج بھی ہم سب سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔

اب ظاہر ہے جس تہذیب نے تہذیب فکر کو

اپنا موضوع بحث بنالیا ہو اس کا فکری مقام کتنا بلند اور تاریخ میں اس کا فکری درجہ کتنا ارفع ہوگا۔ مسلمانوں کا یہ فکری درجہ دوسروں کے مقابل کتنا بلند تر ہے اس کا پیمانہ ان کے فکری قوانین یعنی ان کی منطق ہے۔ ان کے ان فکری قوانین کا دوسرے تمدنوں کے فکری قوانین سے مقابلہ کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ اس مقابلہ میں کتنے کامیاب ہوگئے ہیں۔

عام طور پر اس طرح کے توازن میں ایک سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ تمدنوں کے مادی سازو سامان اور آلات و مشینری کو فکری ارتقا کا پیمانہ خیال کرلیا جاتا ہے حالانکہ یہ چیزیں تمدن کے لئے محض ردّ و مداد کا کام دیتی ہیں۔ اصل تمدنی روح فکری اعتلا یعنی خالص نظری مباحث ہیں جو ہر عہد میں اپنی اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ مادی سازو سامان نہیں جو حالات کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ بلکہ وہ فکری اثاثہ ہے جو ہمیشہ اپنی افادیت برقرار رکھتا ہے۔

عربوں کا دوسرا محبوب موضوع فلسفہ مابعد الطبیعیات ہے جس کی تنظیم انہوں نے منطق کے فکری قوانین کے ماتحت کی ہے پہلی منزل تھی فکر کے قوانین کی تعیین، یہ کام منطق میں تکمیل کو پہونچا۔ دوسرا کام تھا منطقی مباحث میں ان فکری قوانین کا صحت کے ساتھ استعمال، یہ کام فلسفہ میں سرانجام پایا۔ فلسفہ کی بحثوں کو عربوں نے انہیں اصول کے ماتحت کیا ہے جن کی سچائی منطق میں طے کردی گئی ہے جس بحث میں منطق یعنی انسانی فکر کے قوانین کی خلاف ورزی کی گئی وہیں اس کو ٹوکا گیا اور بحث کو پھر معینہ قوانین کے ماتحت لے آیا گیا۔ اس طرح فلسفہ کو ایک ایسا منضبط علم بنا دیا گیا جس کے مباحث مرور ایام سے اپنی افادیت نہیں کھوتے۔ یوں بھی فلسفہ میں ایسے بنیادی سوال زیر بحث آتے ہیں جو شیخ بوعلی سینا اور وائٹ ہیڈ کے بقول دائمی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وائٹ ہیڈ نے اپنی مشہور تصنیف سائنس اور دنیائے جدید کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> "فلسفہ کو مباحث اوّلیہ کی تحقیق و جستجو پر اصرار کرنا چاہیئے"۔

اسی بحث میں آگے چل کر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے:۔

> "اگر فلسفہ کی بابت میرا مذکورہ نقطۂ نظر صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فلسفہ علمی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ اہم اور موثر علمی سرگرمی ہے، مزدور چونے اور گارے کو حرکت میں نہیں لاتے کہ فلسفہ عمارت کی تعمیر کرڈالتا ہے۔ فلسفہ ہی روحوں کی اعلےٰ عمارتوں کی تعمیر کرتا ہے"۔

فلسفہ کے فرائض کی بابت عہدِ جدید کے اس ممتاز فلسفی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے اور عرب نہ صرف یہ کہ اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں بلکہ وہ فلسفہ کے ان کارناموں کا عملی مظاہرہ بھی کرلیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی واضح مثال زمان یعنی ٹائم کی وہ اہم بحثیں ہیں جو عربوں نے کی ہیں اور جنہیں آج بھی آئن اسٹائن اور منکووسکی نے چھیڑ رکھا ہے ان مباحث کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ زمان اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ حرکت کی مقدار کا نام ہے

اور یہی ہے ٹھیک وہ نقطۂ نظر جسے عربوں کے مشائیہ فلسفیوں نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ **الزمان ہو مقدار الحرکۃ** یعنی زمانہ حرکت کی مقدار کا نام ہے۔ گویا زمان کی بحث میں جو بنیادی دوامی سوالات ہیں ان میں سے ایک ہے عربوں کی تحقیقات اور فکری مباحث کا ماحصل بھی وہی ہے جو آئن اینسٹائن اور منکوسکی کے مباحث کا خلاصہ ہے۔ یہی حال دوسرے بنیادی مباحث کا ہے جن میں عربوں نے بالکل جچی تلی باتیں کہی ہیں۔ جو وقت کے بدلنے کے ساتھ نہیں بدل سکتیں۔

عربوں کی فکری خدمات کے سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ انہوں نے یونانی فلسفہ پر کیا اضافے کئے اور وہ کون سے اچھوتے مباحث ہیں جو عربوں کے ساتھ مخصوص تھے اور جن میں وہ یونانیوں کے ممنونِ احسان نہیں ہیں۔

سوال معقول ہے مگر اس سلسلے میں ایک بنیادی چیز کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات آسانی کے ساتھ بھلا دی جاتی ہے کہ اکثر بنیادی مباحث اور اصول اولیہ کی تعیین میں نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا یونانیوں، ہندوستانیوں یا دوسری اقوام قدیمہ کی ممنون احسان ہے، اس لئے کسی قوم کی خدمات کو صرف یہ دیکھ کر نہیں پرکھا جا سکتا کہ اس نے وہی مباحث چھیڑے ہیں جو اس سے قبل چھیڑے گئے تھے بلکہ باہم توازن کا طریقہ یہ ہے کہ ان دونوں قوموں کے ہم موضوعی مباحث کو ساتھ ساتھ پڑھا جائے اور پھر ان کا باہمی فرق معلوم کیا جائے خاص طور پر ان مباحث میں تو ایسا کرنا بالکل ضروری ہے جن میں سنسنی خیز انکشافات کسی خطرناک نتائج(؟) ہونے یا کسی تباہ کن مواد کی ایجاد کا امکان نہ ہو ایسے خشک مباحث میں آہستہ آہستہ جو فرق رونما ہوتا چلا جاتا ہے اُسے عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور چند موٹی موٹی چیزیں یکساں دیکھ کر یکسانیت کا حکم لگا دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ دو جدا چیزیں ہوتی ہیں جن میں ایک مبتدیانہ اور دوسری بالغ النظری کی پیداوار ہوتی ہے۔ عربوں اور یونانیوں کے توازن میں بھی ہمیں اسی احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہیئے اور ان کے مجموعی فکری اثاثوں کا مجموعی انداز میں مقابلہ کرکے ان کی باہمی خصوصیتوں اور برتری اور فروتری کو جانچنا چاہیئے

جے برنٹ نے جو خود بھی یونانی زبان کا بہت بڑا ادیب ہے اپنی کتاب "فلسفۂ یونان" میں یونانی مفکروں کے مباحث پر دلچسپ بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ زمرن اے۔ ای۔ ٹیلر۔ جی۔ سی۔ فیلڈ۔ ایف۔ ایم۔ کارن فورڈ گلبرٹ مرے اور سر ٹامس ہیلتھ نے افلاطون کے فلسفہ یونان کی سیاست، مذہب اور ریاضیاتی نظریوں کی تاریخ اور ارتقاء پر اپنی کتابوں میں عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ حال میں رسل نے اپنی تاریخ فلسفہ یورپ میں یونان کے فکری مباحث پر بڑی عالمانہ بحث و تنقید کی ہے اسی طرح پلوٹینس کی افلاطونیہ جدیدہ پر کافی اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ ان سب کو مسلم فلاسفہ کی منطق کے مقابل رکھئے۔ پلوٹینس کے وحدت الوجود کے تصور کو ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور صدرا شیرازی کی منطق کے مقابل لائیے تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں کتنا نمایاں فرق ہے۔ منطق میں ارسطو کی آرگنن کو بوعلی کی الشفاء

کے ساتھ رکھ کر پڑھیئے تو آپ فیصلہ کر سکیں گے کہ ذہنی فکری جامعیت کہاں پائی جاتی ہے اور عربوں کی خدمات واقعی کتنی قیمتی اور کس قدر اہم ہیں۔

حقیقت یہ ہے جہاں تک بنیادی مسائل اور ذہنی مباحث کا تعلق ہے بیسویں صدی کی سائنس کی باقی بحثوں سے قطع نظر جس میں عرب مفکروں کی دقت نظر ہمہ گیری اور بڑی حد تک منطقی تسلسل پایا جاتا ہے دُنیا کی تمام فکری بحثیں جن میں کانٹ کی CRITIRE OF PURE REASON کی پیچیدہ بحثیں بھی شامل ہیں عرب فلسفہ کی بالغ نظری کا مقابلہ نہیں کرتیں رہی جدید سائنس کی دقیق بحثیں جن میں اضافیت جیسا عظیم نظریہ بھی شامل ہے جو بلاشبہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا فکری معجزہ ہے سو ان کی افادیت ہی نہیں عالمانہ اور مفکرانہ بالغ نظری سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ان پیچیدہ اور عالمانہ بحثوں میں بھی اکثر وہ منطقی تسلسل مفقود ہو جاتا ہے جو ایسے اعلیٰ مباحث کے لئے مایۂ امتیاز ہونا چاہیئے اور جس کا عرب سب سے زیادہ خیال رکھتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آج کی خالص فکری بحثوں میں بھی عربوں کی فکری خدمات سے استفادہ ممکن ہے۔

ثقافت و انتشار

جناب الطاف گوہر صاحب سی۔ ایس۔ پی۔ کراچی

حال ہی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کے ادارۂ تصنیف و تالیف" کی طرف سے میتھو آرنلڈ کی مشہور عالم کتاب "کلچر اینڈ انارکی" کا ترجمہ "ثقافت و انتشار" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ آرنلڈ کی تصنیف پہلی مرتبہ کتابی صورت میں ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی تھی اور بالاتفاق رائے یہ کتاب آرنلڈ کی نثری تحریروں میں اعلیٰ درجہ کی سمجھی گئی ہے۔

آرنلڈ نے اپنے وقت کے سماجی اور معاشرتی نظام کا بڑی بیدردی سے تجزیہ کیا۔ اسے اپنے ارد گرد مادی طاقتیں کامیاب ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ روایات اور قدیم ادارے ایک ایک کر کے اپنا مقام خالی کر رہے تھے۔ اس کی قوم انتہائی خود پسندی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہو چکی تھی۔ انگلستان بھر میں شدید سیاسی جوش کی ایک عارضی لہر آئی ہوئی تھی۔ قوم کے ذہنی انتشار کا اظہار ہر طرف سے بے ڈھنگے اور بے قاعدہ طور پر بسے ہوئے صنعتی شہروں "شخصی آزادی" کے بلند بانگ دعووں اور دولت اور مشین کی پرستش کی صورت میں ہو رہا تھا۔ آرنلڈ نے اپنی کتاب میں ان تمام عناصر کا جائزہ لینے کے بعد کلچر کے بنیادی احساس کی ضرورت پر زور دیا۔

ترجمہ انعام عظیم برنی صاحب اور اخلاص حسین صاحب نے کیا ہے۔ (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

ضخامت پانچسو صفحات۔ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ۔ جلد اور گرد پوش اعلےٰ قیمت چھ روپے

عوامی تعلیم کا ایک منصوبہ

از جناب شبیر بخاری ایم۔ اے۔ بی ٹی۔ پی ای ایس
بہاولپور

جمہوریت اور عوامی تعلیم

پاکستان کے اسلامیہ جمہوریہ بن جانے سے اس امر کی ضرورت بڑھ گئی ہے کہ مسئلہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ محل توجہ قرار دیا جائے اور مسلسل کوشش کی جائے کہ تھوڑی سے تھوڑی مدت میں زیادہ سے زیادہ آبادی تعلیم یافتہ ہو جائے کیونکہ جمہوریت کی افادیت اور ابقاء کا حصر و مدار ہی تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت پر ہے۔ عصر حاضر کے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کی تعلیمی حالت پر نظر ڈالنے سے پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں کی قومی حکومتوں نے اپنے عوام کو زندگی کے فائدوں اور سہولتوں سے یکساں طور پر متمتع ہونے کے لئے ان کی خداداد صلاحیتوں کو اس درجہ چمکا دیا ہے کہ جمہوریت ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمت غیر مترقبہ بن گئی ہے برطانیہ اضلاع متحدہ امریکہ اور جاپان میں عملاً کوئی فرد جاہل نہیں ہے۔ کینڈا روس جرمنی کی زائد از ۹۵ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے تہذیب و تمدن انسانی کی عالمی اور بین الاقوامی جد و جہد میں ان ممالک کے کارہائے نمایاں کسی رسمی صراحت کے محتاج نہیں۔

ابتدائی تعلیم کی مختصر تاریخ

برعظیم پاک و ہند پر قریب پونے دو سو سال تک غیر ملکی اقتدار رہا اور یہ دور تاریخ عالم میں بجا طور پر حیات انسانی کے نہفتہ جریدہ اور نشاۃ ثانیہ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن برطانیہ عظمیٰ کی استعمار پرستی کا یہ ایک ادنیٰ شاہکار ہے کہ اس طویل عرصہ میں خواندگی کا معیار فیصد زیادہ سے زیادہ ۹ رہا۔ اور قومی حکومت کے نو سالوں کی کوشش کے باوجود آج پاکستان کے مختلف حصوں میں معیار خواندگی مندرجہ ذیل ہے۔ مشرقی پاکستان ۱۰۵۸% سابقہ سرحد ۷۸ء۸% سابقہ بلوچستان ۸۲ء۵% کراچی ۳۱ء۳% سابقہ بہاولپور ۱۶% سابقہ پنجاب ۱۰ء۱% سابقہ سندھ ۶% سرحدی ریاستیں ۳ء۱% سابقہ خیرپور ۸ء۵% سابقہ بلوچستانی ریاستیں ۲ء۵% گویا مجموعی طور پر ۱۳ء۱%

آبادی لکھنا پڑھنا جانتی ہے۔

برطانوی دور حکومت تعلیم سے جو بے توجہی برتی گئی ہے مندرجہ بالا اعداد و شمار اس کی پوری پوری نشان دہی کر رہے ہیں۔ اس وسیع ملک میں ابتدائی عوامی تعلیم کی تاریخ بیحد مختصر ہے۔ ۱۸۲۵ء میں پہلی دفعہ بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں ورنیکلر اسکول قائم کئے گئے۔ اور بعض مدارس کو امداد دی گئی۔ ۱۸۴۳ء میں ان عوامی مدارس کے لئے دو آنے ماہوار فیس وصول کرنے کا حکم صادر ہوا۔ صوبہ سرحد کے لفٹنٹ گورنر جیمز تھامسن نے جسے متحدہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کا باپ کہتے ہیں ایک اسکیم تیار کی جس کی رو سے دو سو گھروں کے ہر گاؤں میں مدرسہ قائم کیا جانا تھا۔ زمینداروں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ ایسے مدارس کے لئے زمین وقف کریں اور حکومت کی جانب سے انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ مدارس کے لئے مخصوص کردہ زمین پر لگان وصول نہ کیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ اس مفید اسکیم کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے منظور نہ کیا اور مسٹر تھامسن کو ۱۸۴۶ء میں ایک اور اسکیم پر اکتفا کرنا پڑا جس کی رو سے مرکزی مقامات پر حکومت نے مدارس قائم کئے اور لوگوں کو شوق دلایا گیا کہ وہ اس قسم کے مدارس اپنی اپنی بستیوں میں قائم کریں۔ ۱۸۵۵ء میں محکمہ تعلیم قائم ہوا اور اہم بستیوں میں مدارس کھولنے کا پروگرام تیار ہوا۔ ۱۸۶۵ء میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی ہوئی۔ اور گرانٹ ان ایڈ کا طریق جاری ہوا۔ بعد ازاں پرائمری تعلیم لوکل باڈیز کی تحویل میں دیدی گئی۔ گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی رو سے محکمہ تعلیم کو محکمہ جات منتقلہ میں شمار کیا گیا۔ اور اسے صوبائی وزراء کی تحویل میں دیدیا گیا ۱۹۲۶ء میں بعض علاقوں میں جبری تعلیم کا ایکٹ نافذ ہوا لیکن بنیادی طور پر یہ مسئلہ لاینحل رہا۔

۱۹۳۷ء میں کانگریسی حکومت کے برسر اقتدار آنے سے بنیادی تعلیم کی ایک اسکیم تیار ہوئی۔ اسکے مبادیات اکتوبر ۱۹۳۷ء میں واردھا میں منعقد ایک کانفرنس میں طے ہوئے جس کے صدر مشہور ہندو لیڈر گاندھی جی تھے۔ اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک ایسا منصوبہ طیار کیا جائے جس سے مفت عوامی ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ یہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ اور اس سے طالب علم کا اپنے ماحول میں سے چنی ہوئی کسی مرکزی دستکاری سے لگاؤ پیدا کیا جائے گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر حرفہ کی تعلیم اچھی طرح دی جائے تو اس کے ذریعہ سے مدرسہ کا خرچ نکل آئے گا ان کے خیال میں اس طرح حکومت کو بے فیس کی لازمی بنیادی تعلیم جاری کرنے میں مدد ملے گی۔ ورنہ آج ملک کی کسی سیاسی اور مالی حالت کو دیکھتے ہوئے بنیادی تعلیم کا خرچ اٹھانا حکومت کے بس کی بات نہیں"۔ ایک اور جگہ انھوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ "ہر مدرسہ اپنا خرچ آپ نکال سکتا ہے۔ بشرطیکہ حکومت اداروں کی بنی ہوئی چیزوں کو خرید لے"۔

دارد ہا اسکیم اس وقت کے ملکی تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کی بعض اہم جزئیات سے جماعتی اور فرقہ دارانہ منافشات کی راہیں بھی نکلتی تھیں۔ حرفہ پر غیر معمولی زور دینے کی وجہ سے ماہرین تعلیم کو بھی اس سے اتفاق نہ تھا۔ مرکزی مشاورتی تعلیمی بورڈ نے بھی اسے خرچ کم کرنے اور اداروں کو خود کفیل بنانے کے لحاظ سے تو دلچسپ تجویز قرار دیا اور نظریاتی اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھایا گر حرفہ کے ذریعہ سے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کا تصوّر ان کے نزدیک مفاد تعلیم کے منافی تھا۔

جنوری ۱۹۴۴ء میں مشہور جان سارجنٹ اسکیم منظرِ عام پر آئی۔ اس جامع اسکیم کی رو سے برِ عظیم پاک و ہند کی پوری آبادی کو چالیس سے پچاس سال تک تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا تھا۔ اور اس عظیم مہم کی تکمیل میں ۳۱۲ کروڑ روپیہ صرف کیا جانا تجویز کیا گیا تھا۔ یہ کچھ نو من تیل اور رادھا کے ناچ کا سا معاملہ تھا۔ چنانچہ بورڈ کے دو اراکین مولوی تمیزالدین صاحب اور سعید الرحمٰن صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ میں اس کی طرف واضح اشارہ بھی کیا۔ تعمیر بعد از جنگ کی دوسری تجاویز کی طرح یہ تعلیمی منصوبہ بھی کوئی پائیدار نتیجہ مرتب نہ کر سکا اور دفتری فائلوں کے انبار میں دب کر ختم ہو گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں مہر آزادی طلوع ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا اسلامیان پاکستان پر فکر و عمل کی نئی راہیں کھلیں اور انھوں نے سب سے پہلے اپنے ملک کے مسئلہ تعلیم کو محور فکر بنایا۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں یہ اہم قرارداد پاس ہوئی کہ مفت لازمی تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا جائے گا جس کا نصاب پانچ برس پر حاوی ہوگا یہ مدت بتدریج آٹھ سال کر دی جائے گی۔ اسکے لئے خاص ٹیکس عاید کیا جائے گا جو ریاستی اور صوبائی حکومتیں تجویز کریں گی۔ اس کانفرنس کی جملہ قراردادوں کا ملک نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کے بعد مختلف تعلیمی کمیٹیوں کانفرنسوں اور سیمی ناروں میں اس کا شد و مد سے ذکر کیا جاتا رہا۔ لیکن صورت حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی حالیہ پانچ سالہ اسکیم کے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن اس میں بھی غالباً مصنفین اس مسئلہ کی اہمیت کا پورا احاطہ نہیں کر سکے اور انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ اسے معرض التوا میں ڈال دیا ہے کہ۔

عوامی ابتدائی تعلیم کا نظام اہم ترین ضرورت ہے مگر اس کے اخراجات اور اساتذہ کی تربیت کے مسئلے کا خیال کرتے ہوئے یہ معقول بات معلوم نہیں ہوتی کہ ہم بیس سال سے پہلے اس مقصد کے حصول کی توقع کریں۔

تعمیر ملت کے ممکن پروگرام متقضی ہیں کہ ہم بیس سال سے قبل اس مقصد کے حصول کی مساعی کا آغاز کریں اور ضرورت ہے کہ ہم ان ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں جنھیں ایسے ناسازگار حالات میں سے گزرنا پڑا جن میں سے ہم آج گزر رہے ہیں۔

انگلستان سترھویں صدی کے انگلستان کی تعلیمی اعتبار سے قریب قریب وہی کیفیت تھی جو اب ہمارے ملک کی ہے۔ ۱۸۱۱ء میں NATIONAL SOCIETY FOR PROMOTING THE EDUCATION OF THE POOR IN THE PRINCIPLES OF THE CHURCH OF ENGLAND اور BRITISH & FOREIGN SCHOOL SOCIETY کی بنیاد ڈالی گئی۔

اول الذکر کے بانی ڈاکٹر بیل تھے انھوں نے لوگوں کے مذہبی جذبات سے اپیل کی اور انھیں تعلیم عامہ کے کام کے لئے مذہبی تعلیم کے نام پر ابھارا۔ جان لنکاسٹر نے اپنے نئے طریق تعلیم کے ذریعہ سے بیل کے کام کو تقویت بہم پہنچائی۔ ان مخلصانہ سرگرمیوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ حکومت نے ۱۸۳۳ء میں بیس ہزار پونڈ گرانٹ منظور کی جو ۱۸۳۹ء میں ۳۰ ہزار کر دی گئی چنانچہ ۱۸۳۹ء میں عوامی تعلیم کے اس کام کا جائزہ لینے کے لئے پریوی کونسل کی خاص کمیٹی تشکیل کی گئی جس کے پہلے سکریٹری سرجیمس کے شٹل ورکٹ تھے جن کی ساعی ابتدائی تعلیم کے استحکام میں ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ ۱۸۶۱ء کے ضابطہ کی رو سے گرانٹ کی تقسیم نتائج امتحانات پر مبنی قرار دی گئی۔ باقاعدہ اسکول بورڈ قائم ہوئے۔ پرائیویٹ مذہبی انجمنوں اور سوسائیٹیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور یہ اس مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج برطانیہ کے ۵۸ لاکھ طلباء ایسے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں جنھیں L.E.A.S. چلا رہی ہیں اور سرکاری طور پر قائم شدہ اداروں میں صرف ۹۶ ہزار طلباء وطالبات تعلیم پاتے ہیں۔

چین دوسری درخشندہ مثال چین کی ہے حکومت چین نے عوام کے وطنی اور مذہبی رجحانات سے مدد لی اور ملک بھر میں ابتدائی عوامی اداروں کا ایک وسیع جال پھیلا دیا دس کنبوں کی کمیٹی کا نام CHIA ہے جو اپنے علاقے میں ابتدائی تعلیم گاہ قائم کرنے کا ذمہ دار ہے۔ دس چیا پر مشتمل PAO بنتا ہے جو چار جماعتوں کا مدرسہ قائم کرتا ہے دس پاؤ ملکر چونگ بنتے ہیں جن کا فرض ہے کہ وہ چھ جماعتوں کا مدرسہ قائم کریں۔ یہ عوامی جماعتیں ان ابتدائی درسگاہوں کے جملہ انتظامات کی ذمہ دار ہیں اور حکومت چین کو صرف اونچی تعلیمی درسگاہوں اور کلیات کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ علاقائی اداروں کا نصاب تعلیم امریکی مدارس کی طرح ماحول کے تقاضوں کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور رسم الخط کو آسان بنانے اور WALKING STICK کے فروغ سے تعلیم عام کرنے کے امکانات روشن تر ہوگئے ہیں۔

بھارت عوامی تعلیم کے سلسلے میں تیسری مثال ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کی ہے پہلی پانچ سالہ اسکیم میں ابتدائی تعلیم میں عوامی تعاون پر بجد زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں اظہار کیا گیا ہے کہ تعلیم کے معاملے میں یہ ظاہر ہے کہ لوگ نقدی جنس محنت زمین اور ضروری سہولتیں بہم پہنچانے میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ عوام تک یہ رسائی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ عمارت بنا دینا فرنیچر اور ضروریات

مدرسہ مہیا کرنا نقدی یا فصل کے موقعہ پر جنس کی صورت
میں چندہ دینا یا فصل کے بعد تعمیری کام میں خود مدد
دینا اور مدرسہ کو اپنی ذمہ داری میں لیکر بہتر طریق پر
چلانا۔ بھارتی حکومت کو عوام کا تعاون حاصل کرنے میں جو
کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ پہلی پانچ سالہ اسکیم میں تعلیم کے لئے ۱۵۰ کروڑ روپیہ
مہیا کیا گیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء کے آخر تک ۲۰ ہزار پرائمری
اسکولز اور پانچ ہزار سات سو جونیر بیسک اسکول
کھولے گئے۔ دوسری پانچ سالہ اسکیم میں ۶ سے
گیارہ سال کے ۵/۵ ۵۰ بچوں کو درس گاہوں کی
آغوش میں لانے کے لئے منصوبہ میں بطریق ذیل گنجائش
رکھی گئی ہے۔

عمر	۵۰-۵۱	۵۳-۵۴	۵۵-۵۶	۶۰-۶۱	اضافہ
۶-۱۱	۲۴ لاکھ	—	۵۰ لاکھ	۵، لاکھ	۵۰%

اس عظیم تعمیری کام میں بھارت سیوک سماج اور
پنچائتوں نے خاص طور پر دلچسپی لی اور حکومت کا
ہاتھ بٹایا یہ امر محتاج صراحت نہیں کہ اس مہم کو عوام
کے جذبات مذہبیت و وطنیت سے پوری پوری
تقویت ملی۔

بلا شبہ پاکستان میں تعلیم عامہ کے لئے ٹھوس
منصوبہ بندی کے کام میں ان ممالک کے تجربات سے
فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے میکسیکو برازیل گولڈ کوسٹ
اور دوسرے ممالک میں اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں
جو کام ہو رہا ہے اس کا غائر مطالعہ بھی تعلیم عامہ کی
مہم سر کرنے کے کٹھن کام میں مد ثابت ہو سکتا ہے۔

پاکستان

پاکستان میں مجموعی طور پر ساٹھ فیصد
بچے اور بچیاں ایسی ہیں جنھیں تعلیم
حاصل کرنے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں
سابق صوبہ مغربی پنجاب کی اسمبلی میں وزارت تعلیمات
کے ترجمان نے انکشاف کیا تھا کہ منصوبہ کے ۵، فیصد
بچے حصول تعلیم سے محروم ہیں ۱۵ ہزار بستیوں میں بچوں کے
لئے اور ۱۹ ہزار بستیوں میں بچیوں کے لئے کوئی مدرسہ
نہیں وزارت تعلیم کے نمائندہ مسٹر جی اے خاں نے
یہ بھی بتایا کہ ان تمام وسائل کے باوصف جو حکومت کو
میسر ہیں ہر سال زیادہ سے زیادہ تین سو ابتدائی
مدارس کھولے جا سکتے ہیں۔ گویا اس حساب سے صرف
سابق صوبہ مغربی پنجاب میں قابل تعلیم تمام موجودہ بچوں کو
تعلیم حاصل کرنے کا حق دینے میں کم از کم ۵۰ سال درکار
ہوں گے یا بصورت دیگر صرف اسی ایک صوبے میں
جدید نظریات تعلیم کے مطابق نرسری اور کنڈرگارٹن
اسکول قائم کرنے کے لئے صرف ابتدائی اخراجات کا کم
از کم تخمینہ ۱۲ کروڑ روپیہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی
بڑی سے بڑی حکومت بھی جس کے وسائل آمدنی ہمارے
ملک کے تناسب ہوں اس شعبہ پر اتنا خرچ نہیں کر سکتی
لہٰذا ہم وہی طریق اپنالیں جو دوسرے ممالک نے
اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ
ترغیب دی جائے کہ وہ حکومت سے تعاون کریں اور
ابتدائی تعلیم کا جزوی طور پر یا تمام کا تمام بوجھ اپنے
کندھوں پر اٹھائیں۔

پاکستانی عوام کے ساتھ مسلسل کام کرنے نے

رہنمائی کی ہے کہ وہ اس معاشرے کے ہاتھوں انتہائی طور پر غیر مطمئن ہیں جو برطانوی نظام تعلیم نے وراثت میں چھوڑا ہے اور اس لئے محض تعلیم کے نام پر اگر انہیں اپیل کی جاتی ہے تو اس میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی انھیں ابھی تک انگریزی مدارس اور ان کے نظام سے اجنبیت کی بو آتی ہے۔

تحریک پاکستان کے پورے پس منظر پر طائرانہ نظر ڈالنے سے پاکستانی قوم کے نفسیاتی خدوخال کا اندازہ ہو جاتا ہے اور علی وجہ البصیرت کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی عوام کا محرک عمل وہی جاذبہ عظیم ہے جس نے ایٹم کے دور میں انھیں پاکستان جیسی مملکت خداداد مسخر کر دی۔

کسی قوم کی عملی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جذبہ نسل کام دیتا ہے یا جذبہ وطن اور یا جذبہ دین۔ یہ امر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان بنانے والی اور اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینے والی قوم کو کسی وطنی یا نسلی تحریک نے بیدار نہیں کیا تھا بلکہ خالصتاً ایک مذہبی تحریک نے ایک نعرہ بلند ہوا پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ یہ الفاظ زبانوں سے نکلے دلوں اور دماغوں کی گہرائیوں میں اتر گئے اور قوم بے محابا خون کے سمندر میں پیر گئی موت کے شعلوں سے کھیل گئی

مذہب عصر حاضر کی اصطلاح میں بعض مخصوص ذہنی عصبیتوں کا نام بن کر رہ گیا ہے درآں حالیکہ اسلام ایک نمو پذیر ہمہ گیر عظیم تعمیری قوت ہے۔ اور مسلمانوں نے ہمیشہ اسی قوت کے صحیح استعمال سے سر بلندی و سرفرازی حاصل کی ہے حضرت امام مالکؒ کا یہ مقولہ کہ جس طریق سے اس امت کے گذشتہ دور کے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی اسی طریق سے آخری دور کے لوگوں کی اصلاح ہوگی خاص طور پر ہمارے سلئے دعوت فکر ہے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت میں مسجد کو صدیوں سے ایک جانا بوجھا ہوا مقام حاصل ہے۔

مسجد مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرکز و محور ہے بقول سید مناظر احسن گیلانی سب سے پہلی مسجد جو مدینہ منورہ میں بنائی گئی وہ پانچوں وقت کی نماز کی جگہ بھی تھی اس میں صفہ کا مدرسہ بھی تھا اس کے ملحقہ حصہ میں مسافر ٹھہرائے جاتے تھے۔ زخمیوں کے خیمہ بھی اسی حصہ میں گاڑے جاتے تھے۔ مقدمات بھی اسی عمارت میں فیصل ہوتے تھے۔ عہد فاروقی میں اس کے متصل ادب شاعری کے چرچے کے لئے بھی جگہ مختص کر دی گئی تھی مرکز اسلام کی یہ مسجد صرف رسمی عبادت گاہ نہ تھی بلکہ اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ تھی۔ جہاں دین و دنیا کے تمام قوانین ترتیب پاتے تھے دنیا بھر کی مساجد اسی مسجد مبارک کے نمونے پر بنائی گئیں۔ اور امتداد زمانہ کے باوجود وہ عبادت اور تدریس و تربیت کا گہوارہ ہیں۔ یہاں تک کہ کسی مسجد کا مکتب کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا ان مکاتب کے سادہ اور پاکیزہ ماحول میں بچے اور بچیاں تعلیم پاتے تھے۔ امام معلم تھا اور عوام میں سربر آوردہ فرض شناس افراد کی کوئی مختصر سی جماعت

تعلیمی کمیٹی تھی جو معلم صاحب کے مواجبات کا ازخود انتظام کر دیتی تھی اور معلم کی معاشی ضروریات باہمی تعاون سے پوری ہو جاتی تھیں قرآن مجید کے احکام اور احادیث نبوی کے ارشادات نے مسلمانوں میں حصول علم کی ایک ایسی لازوال روح پھونک دی تھی کہ امت کا بچہ بچہ شمع علم کا پروانہ تھا اور گاؤں گاؤں میں تعلیم و تدریس کے چشمے جاری تھے۔ یہ ایک عام کہاوت تھی کہ اسلام اور جہالت یکجا نہیں ہو سکتے۔ یہاں ان ممالک کا ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے جہاں آفتاب اسلام نے بالراست ضو باری کی خاکدان ہند ہی کی مثال لیجئے برطانوی دور حکومت سے پہلے مسلمانوں کے دور اقتدار میں ملک کی تعلیمی حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل شہادتوں سے کیا جا سکتا ہے جو غیر ملکیوں کی ہیں۔

ریونڈ وارڈ (۱۸۲۱) اعتراف کرتے ہیں کہ انڈیا اسکولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر اکتیس لڑکوں کے لئے ایک مدرسہ ہے۔

موکس ملر فرماتے ہیں برطانوی راج سے پہلے صرف بنگال میں اسی ہزار دیسی مدارس موجود تھے۔

مسٹر لڈلو (مصنف تاریخ برطانوی ہند) لکھتے ہیں مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں جو اپنی قدیم شان اور حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ عام طور پر بچے لکھ پڑھ سکتے ہیں حساب میں ان کی مہارت خاص ہوتی ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر (سابق ڈائرکٹر صوبہ پنجاب) دیسی مدارس کی تاریخ میں رقمطراز ہیں کہ صوبہ پنجاب میں (۱۸۵۴ء) ۹۸۸۴۲ گاؤں تھے اور ہر گاؤں کی مسجد میں مکتب تھا ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق اس وقت مرد تو مرد عورتیں بھی جاہل نہ تھیں ان مکتب کی افادیت اور انگریزی نظام حکومت میں ان کی حالت کا نقشہ ڈاکٹر ولشہر وک ولیمز نے اپنی کتاب WHAT ABOUT INDIA میں نہایت خوبی سے کھینچا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

مغربی تعلیم کی تحصیل کے لئے جو آسانیاں بیش از بیش مقدار میں ...... مہیا کی گئی ہیں ان سے زیادہ تر ہندو جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک ورنیکولر تعلیم سے نفرت کی گئی اور چھوٹے چھوٹے مکتب جو کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں موجود تھے پست ہونے شروع ہو گئے ان مکتبوں کا تعلیمی سلسلے سے کوئی تعلق نہ رہا اور وہ بند ہو گئے ..... ان مکتبوں نے واقعی ایک اصلی ضرورت کو پورا کیا اور ہندوستان کے بہت سے بڑے بڑے علاقوں کے علم کی بنیاد ایسے ہی غریبانہ ماحول میں رکھی گئی۔ لیکن چونکہ ان مکتبوں کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ نہ انھیں باقاعدہ طور پر منظم کیا گیا اور مغربی تعلیم کا رواج ہو جانے سے یہ مکتب اس تعلیم کی درمیانی کڑی ثابت نہ ہوئے۔ اس لئے خواندہ جماعتوں نے انھیں رفتہ رفتہ ترک کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی تعلیم ایک بھاری بھرکم نظام بن گئی

ہے جو آج دیکھنے میں آرہا ہے۔ بحیثیت مجموعی ملک میں خواندگی کا معیار انتہا درجہ پست ہو گیا ہے یعنی ایک ہزار میں سے ۹۵ افراد پڑھے لکھے ہیں۔

اس اقتباس سے جہاں مکاتب کے ذریعہ سے اس عوامی تعلیمی نظام کی فائدہ مندی کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی سلطنتوں نے ان کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ان کی تنظیم میں دلچسپی نہ لی۔ اور مال کار تعلیم عام کرنے کا یہ ہمہ گیر پروگرام معطل ہو گیا یہ مکاتب بند ہو گئے اور ملک جہالت کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

تنظیم مکتب

مسلمانان برعظیم ہند کے مختلف ادوار میں تنظیم مکاتب کی سعی کی اور کئی صوبوں میں اس خصوص میں ابتدائی کام ہوتا رہا لیکن اسے کسی ہم آہنگ طے شدہ طریق کار کے ذریعہ سے نئے تدریسی و تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر ایک قومی منصوبے کے طور پر اپنانے کی ضرورت تھی۔ مسئلہ اذتاف پر مباحث کے دوران میں اس قسم کی تحریک اٹھی بھی لیکن غیر ملکی حاکموں کو کسی ایک محکوم قوم کے ساتھ ایسی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی جو کسی مفید تعمیری کام میں ممد ہو سکتی قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں پنجاب اسمبلی میں اس معرکتہ الآرا مسئلہ پر بحث چھڑی لیکن بے نتیجہ رہی البتہ بھاولپور میں میجر شمس الدین محمد وزیر تعلیم نے اس منصوبہ کی اہمیت کا احساس کیا مولوی محمد علی درویش مدیر الاام نے اس کی نوک پلک درست کرنے اور نشر و اشاعت کرنے میں سعی کی راؤ حفیظ الرحمٰن وزیر تعلیم نے اسے ایک مرتب اور مضبوط تعلیمی منصوبہ کی شکل دی اور تعلیمی حلقوں کو اس سے متعارف کیا اور مخدوم زادہ سید حسن محمود کی وزارت نے اسے بھاولپور کی پانچ سالہ تعلیمی اسکیم کی بنیاد قرار دیکر منظور کیا شیخ عبدالمجید اور خان بقا محمد خاں ڈائرکٹر تعلیمات کے دور میں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا کام شروع ہوا۔ اس منصوبہ کی مختصر تفصیلات یہ ہیں۔

نمبر ا اغراض و مقاصد

(ا) تعلیم و تعلم کے سلسلے میں مساجد کی تاریخی افادی حیثیت کا احیاء

(ب) آئین جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی دفعہ ۲۵ کی رو سے قرآن مجید کی لازمی تدریس کا انتظام

(ج) نئی پود کی سیرت کو عملی طور پر اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے مسجد کے تربیتی ماحول سے استفادہ۔

(د) جہاں مدارس نہیں ہیں ان دیہات میں عوام کی مدد سے ہر مسجد کے ساتھ کم از کم تین جماعتوں کا مکتب قائم کرنا۔

(ہ) دینی و دنیاوی تعلیم کی رائج الوقت خلیج کو پُر کرنا اور کم از کم پہلی پانچ جماعتوں کا ایسا نصاب مرتب کرنا جو ابتدائی ضروری دینی و دنیاوی ضرورتوں پر حاوی ہو۔

(و) مسجد کو بستیوں کی معاشرتی تمدنی تعلیمی اور

تہذیبی زندگی کا محور بنانا اور دیہات سدھار کے پروگرام میں اس سے مدد لینا۔

طریق کار:- پہلے مرحلے میں اس اسکیم کا مرکز وہ دیہات قرار دیئے جائیں گے۔ جہاں بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ ان دیہات کی سروے میں مندرجہ ذیل کوائف ریکارڈ کئے جائیں گے۔

تحصیل موضع بستی کل رقبہ آباد غیر آباد کل آبادی تعداد قابل تعلیم اطفال تعداد امام مساجد نام امام استعداد تعلیمی مواجبات لوگ کیا کچھ دیتے ہیں دیگر وسائل آمدنی مکتب قائم کرنے کی صورت میں معاونین بعد ازاں مندرجہ ذیل قواعد وضوابط ترتیب دیے گئے۔

دفعہ نمبر (۱)

(الف) شعبہ تنظیم مکاتب کے زیر اہتمام ان بستیوں یا چکوں میں مکتب قائم ہوں گے جہاں بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے لئے کوئی سرکاری یا منظور شدہ غیر سرکاری ادارۂ تعلیم موجود نہ ہو۔

(ب) عملہ تدریس کی کمی کی وجہ سے اگر کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ تعلیم میں معلم امام صاحب کی تدریسی خدمت کی ضرورت ہوگی تو اس کے لئے بتوسط محکمہ متعلقہ باقاعدہ منظوری حاصل کرنا ضروری ہوگی۔

(ج) ان مکاتب میں بچوں اور بچیوں کی یکجا تعلیم ہوگی۔ بچیوں کے لئے الگ درس گاہیں اس صورت میں قائم ہو سکتی ہیں کہ اس بستی میں پرائمری یا مڈل اسکول موجود ہو۔ کوئی خواندہ خاتون معلم امام صاحب کی اہلیہ یا معلم صاحب تدریسی خدمت سرانجام دے سکیں اور ڈپٹی انسپکٹرس صاحب گرلز اسکول ان کے کام سے مطمئن ہوں۔

دفعہ نمبر (۲)

(الف) مکتب کے اجرا کے لئے بستی یا چک کے لوگ ایک کمیٹی بنائیں گے جس کے رکن بستی کے سرکردہ افراد ہوں گے۔

(ب) اس کمیٹی میں ہر موثر برادری کے نمائندگان لئے جائیں گے۔

(ج) اس کمیٹی میں مقامی نمبردار علاقائی پٹواری اور قریبی صدر مدرس بھی شامل ہوں گے۔

(د) کمیٹی کے عہدیدار۔ صدر۔ سکریٹری اور خزانچی ہوں گے۔

(ہ) کمیٹی کی میٹنگ ہر مہینے میں کم ازکم ایک مرتبہ ضرور ہوگی۔

(و) کمیٹی اپنے آمد وخرچ کا باقاعدہ ریکارڈ رکھے گی۔

(ز) کمیٹی ہر ششماہی میں کم ازکم دو دفعہ مکتب کا معائنہ کرے گی۔ اور اسسٹنٹ انسپکٹر صاحب کے دفتر میں رپورٹ بھیجے گی۔

(ح) کمیٹی مکتب کو تعلیمی تہذیبی معاشرتی اور ثقافتی

زندگی کا مرکز بنانے کی ذمہ دار ہوگی۔

دفعہ نمبر (۳) تعلیمی کمیٹی ایک اقرار نامہ پر کرے گی جس میں

(الف) مقررہ میعاد مواجبات کا اظہار ہوگا۔

(ب) مذہبی مواجبات طلباء و طالبات کا اقرار ہوگا

(ج) تعمیر عمارت مکتب کا اقرار ہوگا۔

(د) مکتب کو کامیاب بنانے کی ہمہ جہتی جدوجہد کا اقرار ہوگا۔

دفعہ نمبر (۴)

(الف) مقامی تعلیمی کمیٹی علاقائی یا تحصیل کمیٹی کے ساتھ متعلق ہوگی۔

(ب) تحصیل انتظامی واحدہ تحصیل یا علاقہ مخصوصہ کے مکاتب کے مسائل حل کرے گا۔

(ج) تحصیلی کمیٹی کے اراکین تعلیمی کمیٹیوں کے منتخب نمائندوں اور تحصیل افسران محکمہ جات رفاہ عامہ پر مشتمل ہوں گے

(د) ہر کمیٹی سال میں کم از کم دو دفعہ اپنا اجلاس کرے گی۔

دفعہ نمبر (۵)

(الف) تعلیمی کمیٹیاں ایک ضلعی کمیٹی سے متعلق ہونگی

(ب) ضلعی کمیٹیاں مرکزی ڈویژنل کمیٹی کے ساتھ متعلق ہوں گی۔

(ج) اراکین تحصیلی کمیٹی کے خطوط پر منتخب ہوں گے

دفعہ نمبر (۶) معلم کا تقرر یا تعطل مقامی کمیٹیوں کے دائرہ اختیار میں ہوگا اس میں شعبہ تنظیم کو کوئی دخل نہ ہوگا۔

دفعہ (۷) شعبہ تنظیم کا تعلق صرف مکاتب کی تدریسی زندگی سے ہوگا۔

دفعہ (۸) معلم امام صاحب کا فرض ہوگا کہ وہ۔

(الف) کم از کم چار گھنٹے روزانہ باقاعدہ تعلیم دیں۔

(ب) تعلیم کے اوقات میں کوئی نجی کام نہ کریں۔

(ج) نقشہ تقسیم نصاب کے مطابق تدریسی کام کرائیں

(د) تربیتی مراکز میں بلا عذر شرکت کریں۔

(ہ) مشتق لائبریری کا استعمال کریں۔

(و) ایک ہفتہ کی رخصت کے لئے مقامی کمیٹی اور اس سے زیادہ کے لئے ضلعی اسسٹنٹ انسپکٹر تعلیم کی طرف رجوع کریں۔

(ز) بستی کی تعلیمی اخلاقی اور تمدنی اصلاح کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔

دفعہ (۹) انسپکٹر صاحب کا فرض ہوگا کہ وہ

(الف) اس اسکیم کو زیادہ سے زیادہ دیہات میں پھیلائیں۔

(ب) اپنے حلقہ کی سروے کا مکمل ریکارڈ رکھیں۔

(ج) اپنے حلقہ میں الاٹ شدہ زمین کے مفصل کوائف محفوظ کرتے رہیں اور ان کا تحصیلی ریکارڈ آفس سے مقابلہ کرتے رہیں۔

(د) ہر مہینہ میں پندرہ دن دورہ کریں جس میں زیر معائنہ مکاتب کے مندرجہ ذیل امور علی الخصوص پیش نظر رکھیں۔

سال کی پہلی ششماہی :- عوام کے اجتماعات برائے ترغیب تعلیم رجسٹر داخل خارج فارغ التحصیل طلباء کا مستقبل۔ نقشہ تقسیم نصاب - عمارت مکتب ضروریات تعلیم گشتی لائبریریاں - طریق تدریس مواجبات

سال کی دوسری ششماہی :- طلباء و طالبات کا تقریری و تحریری کام مجوزہ نصاب کی تکمیل نماز کی باقاعدگی مکاتب کے مقابلہ ہائے تعلیمی و تفریحی مواجبات۔

(ہ) ہر مہینے میں ایک ہفتہ ریفریشر کورس برائے آئمہ حسب طے شدہ پروگرام منعقد کریں۔

(و) دورہ کے دوران میں معلم امام صاحبان پر قطعاً کوئی بوجھ نہ ڈالیں۔

(ز) پندرہ روزہ ڈائری کارگزاری اور ماہوار نقشہ تعداد طلباء باقاعدہ بھجوائیں۔

نوٹ :- کسی مکتب کے مواجبات کا معقول اور باقاعدہ ہونا انسٹرکٹر صاحب کی کارگذاری شمار ہوگی۔

دفعہ نمبر (۱۰) ضلعی افسران معائنہ کا فرض ہوگا کہ

(الف) اسکیم کی نشر و اشاعت میں زیادہ سے زیادہ سعی کریں۔

(ب) ضلعی سروے ریکارڈ اور مکاتب کے کوائف کا تفصیلی جائزہ لیں۔ اور ان کی باقاعدہ درجہ بندی کریں۔

(ج) ضلعی زرمتا جری کی آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھیں۔

(د) ہر ششماہی کے بعد مکاتب کی گرانٹ کی فہارس بیرھ کے قواعد ترتیب دیں۔

(ہ) ہر مہینہ میں پندرہ روز دورہ کریں اور انسٹرکٹرز کے کام کی کما حقہ پڑتال کریں۔

(و) ماہوار رپورٹ کارگذاری بھیجیں۔

(ز) تربیتی مراکز گشتی لائبریری۔ لنگوافون پروگرام ایچ ون ٹیچ ون - نوتعصب امپریشن کیمپین تحریک ترجمہ کلمہ طیب - خیر الانام خود کفیل امام - اور دیگر مفید تحریکوں کی رفتار ترقی کو تیز کریں۔

(ح) ضلعی افسران محکمہ جات رفاہ عامہ کے ساتھ تعاون و اشتراک عمل سے دیہات میں تعلیمی انقلاب برپا کر دیں۔

مساجد کے درجے

(الف) باقاعدہ آئمہ۔ مواجبات کافی اور باقاعدہ

(ب) آئمہ بے قاعدہ مواجبات ناکافی۔

(ج) مساجد موجود آئمہ نہیں۔

آئمہ کے درجے

(الف) میٹرک فاضل یا علامہ جامعہ عباسیہ

(ب) مڈل رابعہ عالم۔

(ج) پرائمری مودب یا درسی۔

ابتداء (الف) اور (ب) درجہ کے دیہات میں

کام شروع کیا جائے گا اور آئمہ کے ہر سہ درجوں کو قبول کیا جائے گا اسکیم کے دوسرے مرحلہ میں وہ بستیاں شامل کی جائیں گی جہاں بچوں کے مدارس ہیں اور ان میں بچیوں کے مکاتب قائم کئے جائینگے تیسرے مرحلے میں قصبوں اور شہروں کی محلہ وار مساجد میں کام ہوگا۔

معلموں کی تربیت

اس اسکیم کی کامیابی کی ضمانت تسلی بخش طور پر پڑھے لکھے وہ معلم امام ہیں جنہیں خدمتِ ملت کا شوق ہے ...... اور تدریس کے جدید ترین تقاضوں کو پورا کر سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ انسٹرکٹر کے ذریعے سے ہر حلقہ میں ہر ماہ ریفریشر کورس (برائے ایک ہفتہ) ترتیب دئے جاتے رہیں گے تعطیلات موسم گرما میں مڈل اور ہائی اسکول میں ایک ماہ کے لئے تربیتی مراکز قائم ہوں گے۔ متحرک تربیت گاہیں بھی قائم ہو سکتی ہیں جو دو دو ماہ کے تربیتی کورس منعقد کریں اور مجموعی طور پر ہر سال میں تین مرتبہ تربیتی نصاب کی تکمیل کرائیں آئمہ کو جے وی کلاس میں داخلہ کی مراعات بھی حاصل ہوں گی۔

نصاب

امام معلمین کے ابتدائی نصاب تربیت کے دو حصے ہوں گے۔ (۱) نصاب امامت (ب) نصاب تدریس۔

(۱) نصاب امامت نظامت امور مذہبیہ بہاولپور کے تجویز کردہ نصاب امامت درجہ چہارم پر مشتمل ہوگا جس کے مندرجہ ذیل چھ پرچہ جات ہونگے منیۃ المصلی۔ نجات المومنین ۲۔ قصد دری رسالہ نماز ۳۔ انواع بارک اللہ ۴۔ پارہ عم (نصف آخر) سورہ یٰسین سورہ مزمل تبارک الذی حفظ ۵ علم عقائد ۶ فقہ (کتاب طہارت۔ کتاب الصلوٰۃ۔ کتاب الصوم۔ کتاب الزکوٰۃ۔ کتاب الحج۔)

نصاب تدریس۔ جے۔ وی۔ کے منظور شدہ نصاب کی تلخیص ہوگی۔ جس کے مضامین مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(۱) اصول تعلیم و نفسیات (ب) نظم و نسق مدرسہ (ج) تدریس اردو (د) تدریس ریاضی (ہ) تدریس دینیات (و) تدریس جغرافیہ۔

نصاب برائے امامت و تدریس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

مکاتب کا نصاب تعلیم

سید سلیمان ندوی کمیشن نے جامعہ عباسیہ کا جو نصاب ترتیب دیا ہے اس کا ابتدائی نصاب برائے درجہ دوران مکاتب میں جاری کیا جائے گا۔ اس نصاب میں یہ پوری گنجائش موجود ہے کہ ان مکاتب کے خریج دوسرے پرائمری یا ماڈل اسکولوں کے طلباء کے دوش بدوش امتحان کامیاب کر سکیں اور ان مدارس میں تعلیم پا سکیں۔ گویا عملاً ان مکاتب کا وہی نصاب ہوگا جو دوسرے مدارس میں رائج ہے۔ البتہ قرآن مجید کی تدریس پر خصوصی توجہ ہوگی اور زندگی کی عملی چھاپ اسلامی ہوگی۔ تشریح کے لئے نقشہ ہائے

ہم مرکز نصاب ملاحظہ ہو۔ جو بورڈ تالیفات نے ترتیب دیئے۔

نصاب (تدریس)

اوقات تعلیم (یومیہ) ۸ بجے سے ۱۱ بجے (موقع کے مطابق انسٹرکٹر صاحب آئمہ کرام کے ایما کے مطابق بول سکتے ہیں، مگر سررشتہ ہذا کو ان اوقات سے مطلع کریں گے۔

جنرل عرصہ ٹریننگ تین ہفتہ۔

مضامین اصول تعلیم و نفسیات۔ نظم و نسق مدرسہ۔ تدریس۔ ریاضی۔ تدریس جغرافیہ۔ تدریس اردو۔ تدریس دینیات۔

پریکٹیکل:- نمونہ کے اسباق۔ مشقی اسباق، تنقیدی اسباق۔ امتحانی اسباق۔

سلیبس

اصول تعلیم:- (۱) تعلیم کے معنی اور ابتدائی تعلیم کے مقاصد۔

(الف) انگریزی حکومت میں تعلیم کا مقصد۔

(ب) پاکستان میں تعلیم کا مقصد۔

(ج) تنظیم مکاتب میں مسجد اور تعلیم کا ربط۔

(۲) تدریس کے چند اصول:- (۱) معلوم سے نامعلوم کی طرف چلنا (۲) آسان سے مشکل کی طرف چلنا (۳) محسوس سے غیر محسوس کی طرف چلنا۔

(۳) جدید طریقہ ہائے تعلیم:- (۱) کھیل کھیل میں تعلیم (الف) کام اور کھیل میں فرق (۲) گروہ وار تعلیم (الف) پرانے مکتبوں میں جماعت بندی (ب) گروہ وار تعلیم کے تجربے (ج) گروہ بندی کے فوائد۔

(۴) سوالات:- (الف) تعلیم میں سوالات کی اہمیت (ب) تدریس میں سوالات کا افادہ (ج) اعادہ (د) بچوں کے ذوق استفسار کی تربیت کیونکر ہونی چاہیئے۔

(۵) تصویریں اور خاکے:- (الف) امدادی اشیاء کی اہمیت۔ (ب) امدادی اشیاء کی تین اقسام (تصویریں۔ ماڈل۔ خاکے۔)

نفسیات:- (۱) بچے کی نفسیات (۲) تکان اور اس کا تدارک (۳) کھیل اور کام اور ان کا باہمی تعلق۔

نظم و نسق مدرسہ:- (۱) معلم امام کا مقام (۲) معلم اور طلباء (۳) دیہاتی معلمین کی مشکلات (۴) معلم کے اسکولوں کے اندر اور باہر فرائض (۵) روزنامچہ لکھنا۔

(۲) وقت نامہ:- اوقات تعلیم کا تعین اور تفریحی وقفہ۔

(۳) خاص مسائل:- (۱) بے قاعدہ حاضری۔ (۲) پس ماندگی کے اسباب اور ان کا تدارک (۳) ایک معلم والے اسکول۔

نظم و ضبط:- (۱) نظم و ضبط کا مفہوم (۲) صفائی (الف) نمونہ پیش کرنے کی اہمیت۔ (ب) کتابوں اور دیگر سامان کی دیکھ بھال (۳) انعامات اور سزائیں (۴) حفظان صحت بہم پہنچائیں دیہات سدھار

انجمن اندر رباہی صوبے کے نظام تعارف اور امام کے فرائض۔

تدریس اردو (۱) زبان کی ضرورت۔ زبان اردو کی اہمیت۔ اردو پڑھانے کے مقاصد۔ (۲) مبتدیوں کو پڑھنا سکھانے کے مختلف طریقے الف، طریق تہجی (ب) طریق بصوت (ج) طریق بین دگو (د) فقرات کا طریق (ر) مرکب طریق

(۳) لکھنا سکھانے کے ابتدائی اصول۔ انگل۔ ریت۔ کلک۔ چاک۔ پنسل اور ہولڈر سے لکھنا

(۴) لکھنے کی تیاری:۔ درست انداز میں بیٹھنا۔ تختی اور قلم کا صحیح طریقے پر پکڑنا اور دوات کو ٹھیک جگہ پر رکھنا۔

تدریس دینیات ضروریات دین (حسب نصاب امامت) (۲) بچے کے کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے عملی ذرائع

تدریس ریاضی (۱) علم حساب کی اہمیت (۲) حساب پڑھانے کے مقاصد (۳) حساب کا طریق تدریس۔ (۴) تین جماعتوں کے نصاب کا اجمالی جائزہ۔

تدریس جغرافیہ (۱) جغرافیہ پڑھانے کے مقاصد (۲) تدریس جغرافیہ میں ماڈل نقشہ کرۂ ارض تصویریں۔ چارٹ اور فلموں کا استعمال پہلی تین جماعتوں کے جغرافیہ کا جائزہ۔

نصاب (امامت) قواعد درباره تنظیم مساجد محکمہ امور مذہبیہ منظور شدہ

گورنمنٹ بہاولپور میں امامت درجہ سوئم کے لئے حسب ذیل نصاب تفصیل ذیل منظور شدہ ہے۔

پہلا پرچہ منیتہ المصلی اردو۔ نجات المومنین (بزبان پنجابی)

دوسرا پرچہ قدوری (ارکان اربعہ یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ) رسالہ نماز۔ از حمایت الاسلام)

تیسرا پرچہ انواع بارک اللہ (بزبان پنجابی)

چوتھا پرچہ پارہ عم یتسا ئلون حفظ و نصف آخر اور سورہ یٰسین۔ سورہ مزمل سورۂ تبارک الذی حفظ۔ چونکہ یہ نصاب نو آبادی کے چکوک کی مساجد کی امامت کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے نصاب میں بعض پنجابی زبان کی کتابیں درج کر دی گئی ہیں۔ لیکن اب چونکہ درجہ سوئم کی مساجد کے امام مکتب درود کے مدرسہ بھی ہوں گے اور ان کو تعلیم قرآن حکیم کے علاوہ اردو حساب۔ دینیات۔ وغیرہ بھی پڑھانا ہوگا۔ اس لئے پنجابی زبان کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بورڈ نے ایک ایسا کتابچہ تجویز کیا ہے جس میں وہ تمام مسائل درج ہوں۔ جو امام کی امامت کے لئے ضروری ہوں گے۔ کتابچہ کا سلیبس پیش کیا جاتا ہے۔

تمہید:۔ امام کے لئے علم عقائد اور علم فقہ کا علم بقدر ضرورت لازمی ہے۔ اسلئے کتابچہ کو دو حصوں میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ حصہ اول

عقائد میں اور حصہ دوم فقہ میں ہو۔

مضامین حصہ اول:۔ باری تعالیٰ کی ذات و صفات۔ وجود واجب تعالیٰ کا ثبوت توحید۔ نبوت اور اس کی ضرورت انبیا علیہ السلام اور عصمت۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی کا آنا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی افضلیت اور ختم الانبیا ہونا۔ ملائکہ کتب سماویہ قرآن حکیم۔ توریت۔ انجیل۔ زبور۔ سوال وجواب قبر۔ عذاب وجزا کا مرتب ہونا۔ علامات قیامت حشر ونشر۔ حساب وکتاب۔ جزا و سزا۔ بہشت و دوزخ پلصراط۔ حوض کوثر۔ شفاعت کبریٰ۔ شفاعت خاصہ۔ لقاء الہی وغیرہ۔

مضامین حصہ دوئم

فقہ:۔ کتاب الطہارۃ (استنجا۔ وضو۔ تیمم۔ مسح علی الخفین۔ باب الانجاس۔ حیض ونفاس۔ طہر۔)

کتاب الصلواۃ:۔ اوقات نماز تعداد رکعت اذان۔ تکبیر۔ ارکان صلوۃ شرائط صلوۃ۔ کیفیت صلوۃ۔ جماعت امامت۔ قضاء الفوائت۔ نوافل۔ سجدۂ سہو۔ سجدۂ تلاوت۔ نماز مریض۔ نماز مسافر۔ نماز جمعہ۔ نماز عیدین قیام رمضان نماز استسقاء۔ نماز کسوف۔ نماز جنازہ۔

کتاب الصوم:۔ روزے کے اقسام واحکام رویت ہلال روزہ کے مفسدات اور اعتکاف۔

کتاب الزکوٰۃ:۔ زکوٰۃ اور اس کے احکام واقسام۔ جانوروں کی زکوٰۃ سونا۔ چاندی کی زکوٰۃ۔ سامان تجارت کی زکوٰۃ۔ زراعت اور پھلوں کی زکوٰۃ۔ زکوٰۃ کے مستحقین اور غیر مستحقین۔ صدقۃ الفطر اور اس کے احکام۔

کتاب الحج:۔ حج کے مسائل۔ احرام۔ قران۔ تمتع۔ میقات۔ جنایات کتاب الحظر والاباحۃ کے ضروری مسائل۔

امامت کے لئے ضروری ہوگا کہ امام کو آخری پارہ نصف اخیر سورۂ یٰسین سورۂ ملک وغیرہ حفظ ہوں

مدارج۔ ان مکاتب کے دو درجے ہوں گے ادنیٰ اور اعلیٰ۔

مکتب ادنیٰ پہلی تین جماعتوں پر مشتمل ہوگا اور اس میں اردو قرآن مجید ریاضی ابتدائی جغرافیہ کی تعلیم دی جائے گی۔

مکتب اعلیٰ میں پانچ جماعتیں ہوں گی قرآن مجید ناظرہ مکمل ہو جائے گا۔ اور نماز وادعیہ کے معانی کی تفہیم ہو جائے گی باقی مضامین وہی ہوں گے جو پانچویں جماعت کے لئے معین ہیں۔

امتحانات کا معیار بطریق ذیل ہوگا (تفصیلات ملاحظہ ہوں)

اوقات تعلیم۔ ابتدا میں اوقات مکاتب کی ہم آہنگی پر زیادہ زور نہیں دیا جائے گا کیونکہ دیہاتیوں کی غالب اکثریت انتہا درجہ مفلس ہے اور بچے اور بچیاں حصول معاش میں

ان کی امداد کرتے ہیں اور مدتوں سے انکی تعلیم سے بے توجہی کا ایک عام سبب یہی رہا ہے۔ اوقات کا تعین تعلیمی کمیٹی کے مشورہ سے ہوگا اور یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مجموعی طور پر دن میں کم ازکم چار گھنٹے تعلیم ہوتی ہے۔

تعلیمی کمیٹی سالانہ اجتماعات منعقد کریں گی جن میں ہونہار طالب علموں کو انعامات دئے جائیں گے اور معلمین اور معاونین میں اسناد حسن کارگذاری تقسیم ہوں گی۔

مکاتب کے مالی وسائل

(۱) مواجبات۔ سالہا سال سے دیہاتی عوام ہر فصل کے موقعہ پر مسجد کے امام صاحبان کی باقاعدہ طور پر یا بے قاعدہ طور پر کچھ نہ کچھ خدمت کرتے ہیں۔ اس علاقہ میں آبادکاری چکوک میں یہ فصلانہ ۱۵ سیر فی مربعہ سے ایک من فی مربعہ تک ہو سکتا ہے پرانی آبادی کی بستیوں میں بھی اہل خیر آدھ پاؤ من یا تین پاؤ پڑ کے حساب سے ان کا حصہ مقرر کرتے ہیں اس آمدنی کے علاوہ شادی غمی عیدین۔ اور دوسرے تہواروں پر بھی امام صاحبان کو لوگ مواجبات دیتے ہیں امام صاحب جتنے زیادہ ہردلعزیز اور مفید ہوں گے یہ مواجبات اسی قدر زیادہ ہوں گے اور انھیں تعلیمی کمیٹیوں کے ذریعے سے معقول اور باقاعدہ بنا دینے سے ان کا معاشی مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

(۲) پنچائت فنڈ۔ پنچائتوں کی افادیت محتاج بیان نہیں۔ ہر پنچائت کے پاس معقول فنڈ جمع ہو جاتا ہے اس فنڈ میں اگر مکاتب کے لئے گنجائش رکھی جائے تو ہر حلقہ پنچائت میں آنے والے مکاتب کے لئے ٹاٹ بلیک بورڈ اور نقشے خریدے جا سکتے ہیں۔

(۳) انجمن ہائے امداد باہمی میں رفاہ عامہ کے لئے فنڈ مقرر ہوتا ہے اس سے علاقائی مکتبوں کے قابل امداد بچوں کی اعانت ہو سکتی ہے اور غریب ہونہار طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دیئے جا سکتے ہیں۔

(۴) اوقاف۔ [illegible] اس حصہ میں ہزاروں ایکڑ زمین وقف کے طور پر موجود ہے جس کی آمدنی لاکھوں روپیہ ہے۔ وقف کے اغراض میں عام طور پر علم دین کی اشاعت داخل ہے لیکن اکثر خانقاہوں کی آمدنی نہایت بیدردی سے اللوں تللوں کی نذر ہو رہی ہے۔ اس آمدنی سے مکاتب ہی نہیں یونیورسٹیاں چل سکتی ہیں۔

(۵) بروئے ضابطہ امور مذہبیہ مد نکاح خوانی کی آمدنی کا مصرف تعلیم ہے۔ یہ روپیہ اس شعبہ میں منتقل کیا جا سکتا ہے بہاولپور میں اس مد کی سالانہ آمدنی سے ۲۰۰ مکاتب کو گرانٹ دی جا سکتی ہے۔

(۶) مسجدانہ یا اسلامی فنڈ۔ یہ روپیہ منڈیوں میں ان لوگوں سے وصول لیا جاتا ہے جو اپنی جنس فروخت کرنے کی غرض سے منڈی میں لاتے ہیں اس روپے میں علاقائی مکاتب کی مالی سرپرستی کے لئے گنجائش ہو سکتی ہے۔ اور مستحق طلباء کو تعلیمی وظائف

دیئے جا سکتے ہیں۔

(۷) علاقائی قومی انجمنوں سوسائیٹیوں اور جماعتوں کے فنڈز سے تنظیم مکاتب کو کافی تقویت بہم پہنچ سکتی ہے۔ آزاد ممالک میں ایسی جماعتیں رفاہ عامہ کے کاموں میں ٹھوس اقدامات کر رہی ہیں۔

(۸) ویلیج ایڈ پروگرام میں امام صاحبان کے تعاون سے ہر اسلامی کام میں کامیابی ہو سکتی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ دیہات سدھار کے جملہ پروگرام اس وقت تک تشنہ رہتے ہیں جب تک کہ بستی کے سب سے بڑے مجلسی مرکز۔ مسجد کا سہارا نہ لیا جائے ویلیج ایڈ فنڈز سے معلم اماموں کو جزوی طور پر امدادی وظائف دیئے جا سکتے ہیں۔

(۹) اراضی کی الاٹمنٹ۔ حکومت بہاولپور نے آبادی کے چکوک میں ۱۰ ایکڑ زمین فی چک تنظیم مکاتب کے لئے مخصوص کر دی یہ زمین محکمہ مال کے ذریعہ سے مستاجری پر دی گئی اور زیر مستاجری سے معلمین کو ہر ششماہی پر گرانٹ دی گئی جس کا معیار کو انف مندرجہ ذیل کے پیش نظر قائم کیا گیا۔

امام کی استعداد	فاضل یا میٹرک	غیر عالم مڈل	موجود پرائمری
طلباء کی تعداد	۱۰۰ طلباء و طالبات سے زائد	طلباء و طالبات ۵۰	۲۰ طلباء و طالبات
لوگوں کی امداد کم از کم	۸ من ششماہی	۶ من ششماہی	۴ من ششماہی سے زائد
مکتب کی معیار (نتائج)	۱۰۰ %	۸۰ %	۶۰ %

یہ گرانٹ فی مکتب ۵۰ روپیہ ششماہی سے ۱۵۰ روپیہ ششماہی تک ہو سکتی ہے۔

اسی طرح متروکہ آراضیات میں سے اس مقصد کے لئے زمین الاٹ ہو جانے سے پرانی آبادی کی بستیوں کے مکاتب کی امداد ہو سکتی ہے۔

(۱۰) مزید گرانٹ کے لئے سالانہ بجٹ میں گنجائش کی سعی کی جا سکتی ہے اور اس طرح سے عوام میں آہستہ آہستہ مسجد میں مکتب کا تصور اس درجہ راسخ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرحلے پر وہ حکومت کی امداد سے بے نیاز ہو جائیں۔ اور ملک بھر میں ابتدائی عوامی تعلیم گاہوں کا ایک مستحکم نظام قائم ہو جائے جو ایک تابناک و درخشندہ مستقبل کی ضمانت ہوگا

(باقی آئندہ)

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۶)

مکاشفات کشفی

اس خانقاہ کو ایسی حیرتناک روشنیوں، ایسی الوہی راگنیوں، ایسی پراسرار مہکوں اور ایسے آسمانی چہروں کا دیدہ زیب و دلفریب و سامعہ نواز مرکز بنا کر سجایا ہے کہ حریم حکمت کے مسافر اثنائے راہ میں جب اس خانقاہ والی موڑ پر پہونچتے ہیں تو اک دم سے ٹھٹھک کر اور انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر تک انگشت بدنداں رہنے کے بعد ان مسافروں کے مجمع میں اک دو رخی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے جو خالص عقلیت کے پرستار ہوتے ہیں، وہ کسی قدر مسکرا کر، حریم حکمت کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں جو خالص جذباتیت پرست ہوتے ہیں وہ سروں کو جھکا کر خانقاہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

فاروقِ اعظم کا تعلیمی نظام

(از سید رشید احمد ارشد استاذ عربی ادبیات کراچی یونیورسٹی)

فاروق اعظم کے تعلیمی نظام کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے پیشتر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عہد اسلام سے پیشتر عربوں میں تعلیمی نظام تو درکنار تعلیم ہی کا وجود نہیں تھا بلکہ عربی زبان مختلف قبائل کی بولیوں میں بٹی ہوئی تھی یہاں تک کہ یمن کے قبائل کی زبان قریش کی زبان سے بہت مختلف تھی حضرت مسیح کی پیدائش سے سینکڑوں برس پیشتر سبا اور حمیریوں کے دور میں جنوبی عرب کا تمدن عالم شباب پر تھا۔ اس وقت ان لوگوں نے خط مسند میں ایک رسم الخط ایجاد کیا تھا جو خط حمیری کے نام سے موسوم ہے ماہرین آثار قدیمہ نے جو کتبات یمن کے کھنڈرات سے برآمد کئے ہیں وہ خط حمیری میں ہیں اب تک جو کتبات دریافت ہوئے ہیں ان کی ادبی اور علمی حیثیت کچھ نہیں ہے مگر لسانی حیثیت سے ان سے عربی زبان کی قدامت کا پتہ چلتا ہے مگر بہت کم الفاظ موجودہ قرآن کی عربی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی زبان میں لکھے ہوئے ہیں جس کے رسم الخط اور زبان سے دور اسلام کے علماء قطعی ناواقف تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم الخط محض بادشاہ اور امراء کی۔ یادگار فتوحات اور دیگر رسومات کے لئے استعمال ہوتا تھا اس کے ذریعہ عوام کو تعلیم دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ دیگر قدیم کتبات کے برآمد ہونے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریری کتبات صرف ان علاقوں میں ہی دستیاب ہوئے ہیں جہاں کسی حد تک خوشحالی تھی اور دیگر قوموں سے بھی ان کے تجارتی اور اقتصادی تعلقات تھے اور ان کتبات میں بھی علمی اور ادبی سرمایہ کچھ نہیں ہے۔ جن سے ان کے تعلیمی نظام کے وجود کا پتہ چل سکے بلکہ لسانی حیثیت سے جداگانہ مختلف بولیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام سے پیشتر جزیرہ نما عرب میں کوئی مرکزی زبان نہ تھی بلکہ تقریباً تمام عرب ناخواندہ تھے ان کا کوئی تحریری سرمایہ نہ تھا اور نہ کوئی علم و ادب تھا اس لئے تعلیمی نظام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رسول کریم کی پیدائش سے تقریباً سو سال پیشتر مکہ معظمہ کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے اور وہاں مختلف میلوں اور بازاروں کی وجہ سے شعر و شاعری کے چرچے شروع ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ایک ایسی عربی زبان کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی تھی جس کو تمام قبائل ایک حد تک سمجھنے لگے تھے یہ قریش کی زبان تھی کیونکہ قبیلہ قریش خانہ کعبہ کا متولی تھا اور وہاں تمام عرب کے قبائل حج کے موقع پر آتے تھے اسی لئے ان کی مذہبی اور تجارتی حیثیت کی وجہ سے ان کی

زبان کو تمام قبائلی بولیوں پر ترجیح حاصل ہوگئی تھی۔ اس موقعہ پر مکہ معظمہ کے قریب عکاظ اور دیگر مقامات پر تجارتی منڈیاں لگتی تھیں کھیل تماشے ہوتے تھے بلکہ شعر و شاعری کی محفلیں بھی قائم ہونے لگیں جن میں عرب کے مشہور شعراء اپنے قصائد قریش ہی کی زبان میں پڑھتے تھے اس لئے انکی زبان دوسری بولیوں پر غالب ہوتی گئی علاوہ ازیں قریش تجارتی سلسلے میں گرمیوں اور سردیوں میں عرب کے جنوب اور شمالی علاقوں میں سفر کرتے تھے اس وجہ سے بھی ان کی زبان دوسرے عرب علاقوں پر اثر انداز ہوتی اور انھوں نے دیگر قبائل اور غیر قوموں کے اچھے اور ضروری الفاظ اپنی زبان میں داخل کئے اس طرح قریش کی زبان وسیع شائستہ اور بین الملکی زبان بنی شروع ہوئی۔ ظہور اسلام پر اسی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا جس نے ہمیشہ کے لئے اس زبان کی مرکزی حیثیت اور دیگر زبانوں پر اس کی برتری قائم کر دی۔ قرآن کریم ہی کے ذریعہ اس زبان کو یہ ترقی نصیب ہوئی کہ اس میں سے مختلف علوم و فنون کے چشمے ابلنے لگے۔ یہاں تک کہ تمام عرب قبائل کی مختلف بولیاں اور لہجے ختم ہوگئے اور تمام عرب میں صرف ایک ہی زبان رہ گئی وہ قرآن کریم کی زبان تھی اسی زبان میں عوام کے لئے پہلی دفعہ تعلیمی نظام قائم ہوا

عہد رسالت میں تعلیم | رسول کریم نے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیکر نہ صرف ان میں اخلاقی اور مذہبی انقلاب برپا کیا بلکہ ان کی زبان کو بھی شائستہ بنایا۔ ان میں سے ناخواندگی کو دور کیا چنانچہ جب جنگ بدر میں کفار کے ایسے قیدی گرفتار کئے گئے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو آپ نے ان کی رہائی کے لئے یہ شرط لگائی کہ وہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواندہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور مسلمان قرآن کریم کو زبانی یاد کرنے کے علاوہ تحریری طور پر بھی لکھنے لگے بلکہ کئی صحابی بھی لکھا کرتے تھے آگے چل کر جب لکھنے کا رواج ہوا اور اس کی تعلیم بڑھتی گئی تو قرآن کریم کے حکم کے مطابق قرض اور تجارتی لین دین کو لکھنے کا رواج ہوگیا۔ چنانچہ خود رسول کریم اور صحابہ کرام کی احادیث کے علاوہ تجارت و معاملات کے بارے میں تحریری دستاویزات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا اسلام چونکہ ایک تبلیغی مذہب تھا اس لئے بالغ اور نابالغ مسلمانوں کو ہر وقت ہر قسم کی تعلیم دی جاتی تھی یہاں تک کہ فوجی تعلیم اور آلات حرب کی ٹریننگ بھی ان کے لئے لازمی ہوگئی تھی اور [illegible] موجودہ زمانے میں جس قسم کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی وہ سب عہد رسالت ہی میں شروع ہوگئی تھی یہاں تک کہ یہودی مذہب اور ان کی مذہبی زبان یعنی عبرانی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بھی آپ نے اپنے صحابہ کو ترغیب دلائی تھی تاکہ یہودیوں کے جھگڑوں کو ان کے مذہبی احکام کے مطابق فیصلہ کیا جائے چنانچہ بعض جلیل القدر صحابیوں نے بہت جلد عبرانی زبان سیکھ لی تھی۔

یہ تعلیم مردوں تک محدود نہیں تھی بلکہ عورتوں اور لونڈیوں تک کو تعلیم دلائی جاتی تھی اور خواتین میں تعلیم عام کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے خاص دن مقرر کر رکھے تھے۔

آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت کے طریقہ کو برقرار رکھا مگر جب حضرت عمر کے

زمانے میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور عرب و عجم کے بے شمار لوگ مسلمان ہوئے تو حضرت فاروق اعظم کو تعلیمی نظام کا دائرہ وسیع کرنا پڑا۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ حضرت عمر فاروق نے اپنے زمانہ میں ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں، ذریعوں کی بے حد جہالت طباعت اور کتابت کا انتظام نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ایسا وسیع نظام قائم کر لیا تھا جو موجودہ زمانے میں مذکورہ بالا سہولتوں کے باوجود مشکل نظر آرہا ہے۔ آپ نے نہ صرف بچوں کے لئے مکاتب قائم کئے تھے بلکہ بالغوں کی تعلیم کا بھی مناسب بند و بست کر رکھا تھا۔

لازمی تعلیم کا انتظام اس تعلیم میں قرآن کریم کی تعلیم کو زیادہ اہمیت حاصل تھی کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم دینی اور دنیاوی ترقیوں کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور اسکی تعلیم کے بعد وہ دیگر علوم سے بے نیاز ہو جاتے تھے اس لئے اسلامی تعلیم ہر مسلمان کے لئے لازمی تھی اور اسی نظام میں انہیں نوشت و خواند جسمانی اور فوجی تعلیم بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ خانہ بدوش بدو بھی تعلیم حاصل کرنے سے مستثنیٰ نہ تھے مگر چونکہ اس قسم کے لوگوں کو جن کی مستقل بود و باش نہ ہو، تعلیم دینا اور ان کی قابلیت کو جانچنا بڑا مشکل کام تھا، اس لئے فاروق اعظم نے مناسب انتظام سے ان مشکلات کو رفع کیا انہوں نے بدوؤں اور اعراب کی تعلیم کو جانچنے اور ان کا امتحان لینے کے لئے چند تعلیمی انسپکٹر مقرر کر رکھے تھے جو ابو سفیان نامی ایک شخص کی زیر سرکردگی ان خانہ بدوش قبائل میں گشت لگا کر ان لوگوں کا امتحان لیتے تھے اور انہیں خلافت فاروقی کی طرف سے یہ اختیارات بھی حاصل تھے کہ جس شخص کو قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو یا وہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوں تو انہیں مناسب سزا دیں۔

نصاب تعلیم بچوں کے مکاتب میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند کی تعلیم بھی دی جاتی تھی یعنی لکھنا اور عربی ادب و زبان کی تعلیم بھی لازمی رکھی گئی تھی تاکہ قرآن کریم کے اعراب میں بچے غلطی نہ کر سکیں۔ لیکن ان مکاتب میں صرف قرآن کریم کی عبارت پڑھانا تعلیم کا مقصد نہ تھا بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین و احکام کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بعض دفعہ فقہ اور اسلامی مسائل کی تعلیم کیلئے الگ الگ معلم مقرر ہوتے تھے لیکن وہ جلیل القدر صحابہ جو قرآن کریم حدیث اور فقہ تینوں کے ماہر ہوتے تھے ہر قسم کی اسلامی تعلیم دے سکتے تھے۔ حضرت ابو الدرداء مشہور صحابی اس قسم کے معلم تھے اور ان کا حلقہ درس جامع مسجد دمشق میں بہت وسیع تھا۔

معلمین کے اوصاف چھوٹے چھوٹے بچوں کے معلمین کے انتخاب میں کافی جد و جہد کی جاتی تھی اور وہ خوش الحان قاری اور حافظ ہونے کے علاوہ لغت اور زبان عربی کے جید عالم ہوتے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم صادر فرما رکھا تھا کہ جو کوئی زبان عربی کا عالم نہ ہو قرآن کریم کی تعلیم دینے کا اہل نہیں بن سکتا۔

چھوٹے بچوں کے مکاتب میں تعلیم دینے والے اساتذہ کی

تنخواہیں پندرہ پندرہ درہم ہوتی تھیں اس سے پیشتر مسلمان تعلیم کی اجرت نہیں لیتے تھے اور مفت پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کو چونکہ باقاعدہ وسیع نظام تعلیم ہر قریہ ہر قصبہ اور ہر شہر میں قائم کرنا مقصود تھا اس لئے جب تک کثیر التعداد معلموں کو محض اس کام کے لئے اجرت نہ دی جاتی اس وقت تک یہ سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

فوجیوں کی تعلیم

حضرت عمرؓ تعلیم میں اسقدر اہتمام فرماتے تھے کہ وہ اپنے گورنروں اور عمال کے نام جو احکام صادر فرماتے تھے ان میں تعلیم قرآن کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا چونکہ فوجیوں کے لئے بھی تعلیم قرآن لازمی رکھی گئی تھی اس لئے اہل فوج کی قرآن خوانی سے متعلق ہر مقام پر ایک باقاعدہ رجسٹر ہوتا تھا جس میں ان کی تعلیمی ترقی کی کیفیت مندرج ہوتی تھی ان میں تعلیم کا مزید شوق پیدا کرنے کے لئے تعلیمی ترقی پر انہیں وظائف بھی دئے جاتے تھے اس قسم کے رجسٹروں کو خلیفۂ اعظم وقتاً فوقتاً دربار خلافت میں طلب فرماتے تھے تاکہ ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہو سکے اس نگرانی سے اہل فوج میں قرآن کی تعلیم اسقدر عام ہوگئی کہ ناظرہ خوانوں کی تعداد بڑھ گئی کہ اس کا کوئی شمار نہ تھا بلکہ حافظوں کی تعداد میں بھی اسقدر اضافہ ہوا کہ عراق کے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص کے لشکر میں جب کہ حضرت عمر کی خلافت کا آغاز تھا تین سو حافظ ہو گئے تھے ان حافظوں کو حضرت عمر طلب فرما کر مختلف دیہاتی اور قصباتی علاقوں میں تعلیم قرآن کے واسطے بھیجا کرتے تھے اور جس قدر تعلیم عام ہوتی گئی اسی قدر قابل معلم اور استاد دور دراز علاقوں میں نومسلموں کو تعلیم دینے کے لئے بھیجے جانے لگے۔

تعلیمی کاموں میں لائق اور فاضل اساتذہ کا انتخاب فاروق اعظمؓ کی اہم خصوصیت تھی۔ تعلیم دینے کا پیشہ محض پیشہ ور معلموں کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ اسلام کے فوجی جرنیل سپہ سالار اور گورنر بھی معلم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اسلام کا ہر ادنیٰ سپاہی بھی تھا اور معلم و مبلغ بھی تھا یہی وجہ ہے کہ ہمیں عہد فاروق کے قابل معلمین کی فہرست میں ان لوگوں کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے ساری عمر جنگلوں میں گزاری تھی اور بقول اقبال مرحوم "تیغوں کے سائے میں وہ پل کر جواں ہوئے تھے"۔

شام کے تعلیمی افسر

فاروق اعظم کے حکم سے مندرجہ ذیل جلیل القدر بزرگ ہستیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ شام کے مختلف علاقوں میں اپنے تعلیمی مرکز قائم کریں۔ وہ اصحاب یہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت ابو الدرداء یہ تینوں حضرات سب سے پہلے حمص پہنچے اور وہاں اسلامی تعلیمات کی ترویج کو مستحکم کیا جب یہ تعلیمی مرکز مضبوط بنیادوں قائم ہو گیا تو اس مرکز کے نگراں عبادہ بن صامت مقرر ہوئے اور حضرت معاذ بن جبل جو ایک دفعہ شام کے اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف اور حاکم اعلیٰ بھی مقرر ہوئے تھے فلسطین کی سرزمین کے تعلیمی مرکز کے نگراں ہوئے عہد رسالت

کے مشہور قاری اور زبردست محدث حضرت ابوالدرداء
شام کے پایہ تخت دمشق میں تعلیمات کے معلم اعلیٰ منتخب
ہوئے اور آپ حضرت عثمان کی خلافت کے آخر زمانے
تک نوجوانان اسلام کو اپنے حلقہ درس سے مستفید فرماتے رہے

طریقۂ تعلیم

حضرت ابوالدرداء کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ آپ نماز فجر کے بعد ہی درس قرآن کا سلسلہ
شروع کر دیتے تھے چونکہ طلباء کی تعداد بہت زیادہ تھی
اس لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ دس دس
مبتدی طالب علموں کی ایک جماعت کے لئے محنتی اور
فارغ التحصیل طالب علموں میں سے ایک مانیٹر مقرر کر رکھا
تھا اور بذات خود سب جماعتوں کی اس طرح نگرانی فرماتے
تھے کو ٹہلتے جاتے تھے اور پڑھنے والوں پر کان لگائے رکھتے
تاکہ درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدہ اور صحیح طریقہ سے
انجام پذیر ہوتا رہے جب کوئی طالب علم پورا قرآن شریف
یاد کر لیتا تھا تو وہ خاص حضرت ابوالدرداء کی شاگردی میں
آجاتا تھا اور اسے باقی ماندہ ضروری تعلیم دیجاتی تھی
آپ کا حلقہ درس اس قدر وسیع تھا کہ جب ایک دن
آپنے اپنے طالب علموں کا شمار کرایا تو معلوم ہوا کہ صرف آپ
کے حلقۂ درس میں سولہ سو (۱۶۰۰) طالب علم تعلیم پا رہے تھے۔

یہ طریقہ تعلیم قرآن کے لئے تھا مگر اسلامی تعلیمات
اور قوانین فقہا کی تعلیم کا طریقہ جدا تھا ان فقہائے
اسلام کے حلقہ درس میں لوگوں کا اسقدر ہجوم ہوتا تھا کہ
بعض دفعہ تیس صحابی بیک وقت تعلیمی خدمت سرانجام دیتے
تھے تعلیم فقیہ کا تعلق صرف نوعمر طلباء اور دیگر شائقین علم
کے ساتھ نہ تھا بلکہ عوام الناس بھی ان مجالس میں شریک
ہوتے تھے اس لئے یہاں کتابی طریقہ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا
تھا بلکہ ایسی مجالس میں فقہائے اسلام کے گرد شائقین علم
دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے تھے اور ہر شخص کو اپنے حالات
کے مطابق سوالات کرنے کا موقع دیا جاتا تھا چنانچہ ہر ایک
باری باری اسلامی مسائل دریافت کرتا تھا اور فقہائے
اسلام دلنشیں پیرائے میں نہایت شافی اور تسلی بخش جوابات
دیتے تھے اس طرح ہر شخص کو اپنی معلومات بڑھانے،
مختلف سوالات کے جوابات سے فائدہ اٹھانے اور
اپنے شکوک رفع کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہی وہ طریقہ ہے
جسے آج کل ماہرین تعلیم بھی بہت پسند کرتے ہیں اس طرح سے
طالبان علم میں علمی تحقیق و تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو
آگے چل کر کائنات عالم کے سربستہ راز اس پر منکشف کر دیتا
ہے اور اسی تحقیقی جذبہ سے بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں
فلسفہ اور سائنس کا شوق پیدا ہوا اور وہ دنیا کے موجودہ علوم
و فنون کے بانی ہوئے۔

حضرت فاروق اعظم نے جس طرح شام میں جلیل القدر
صحابیوں کو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا اسی طرح
آپ نے بصرہ، مصر، کوفہ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں
معلمین کو مقرر کیا تھا۔ بچوں اور بالغوں کی درسگاہوں میں
کتابت سکھانے کا بھی انتظام ہوتا تھا اور ہوشیار معلم انہیں
کتابت سکھاتے تھے چنانچہ ابو عامر سلیم جو حدیث کے راوی ہیں
گرفتار ہو کر بچپن میں مدینہ منورہ آئے تو انہیں مدینہ کے ایک
مکتب میں بٹھا دیا گیا وہاں کا معلم انہیں کتابت کی تعلیم بھی دیتا تھا اور
جب انہیں میم لکھنی سکھائی جانے لگی تو انہیں بتایا گیا کہ میم گائے
کی آنکھوں کی طرح گول ہوتی ہے۔

غدر کی کہانی

(چھٹی قسط)

مسز لوئیٹر کا بیان - لالہ کے گھر کی زندگی

ترجمہ جناب سید برکات احمد صاحب (علیگ)

ظاہر ہے کہ تیرہ یا چودہ جون تک یعنی جس زمانہ کا میں ذکر کر رہی ہوں شاہجہانپور کا ایک ایک یوروپین یا عیسائی قتل کر دیا گیا تھا باقی بچنے والوں میں صرف ہم لوگ یار بیڈمین کے گھر والے تھے ہمارے خطرات بھی ہنوز ختم نہ ہوئے تھے بلکہ اب شروع ہو رہے تھے جیسا کہ آئندہ بیان سے واضح ہوگا دنیائے بیرونی میں بھی کیا گزر رہی تھی جس کی وضاحت ایک واقعہ سے جو ہمارے دوران قیام میں لالہ کے گھر کے اندر پیش آیا ہو جائے گی۔

ایک مہترانی مسماۃ ہتیا ایک مرتبہ مچھلی بیچنے آئی لالہ کی بیوی نے اس سے کہا:

"تم بہت دنوں میں آئیں! معلوم ہوتا ہے آج تم کچھ بیچ نہیں پائیں؟"

اُس نے جواب دیا۔

"ارے لالائن! اب کون خریدنے والا رہا؟ اچھے فرنگی چلے گئے ایک زمانہ تھا جب میں لوئیٹر یا ریڈمین کے یہاں روزانہ جایا کرتی تھی اور اول الذکر کے یہاں سے بغیر چار پانچ آنے لئے واپس نہیں آتی تھی لوئیٹر کی میم نہ صرف مجھ سے خریدتی تھیں بلکہ وہ مجھ سے اپنے لئے مچھلی پکوایا بھی کرتی تھیں اور میں پکا دیا کرتی تھی وہ مجھے دو تین آنے اور دیدیا کرتی تھیں یعنی جتنے کی مچھلی ہوتی تھی اُتنے ہی اور۔"

لالائن نے پوچھا پھر وہ کیا ہوئیں؟

اس نے جواب دیا۔

"کیا بتاؤں! صاحب اور بابا گرجا میں مار ڈالے گئے اور میم صاحب جاکر دریا میں ڈوب گئیں!"

لالائن نے کہا:-

"کیا یہ بات تم سچ کہتی ہو؟"

اُس نے جواب دیا:-

"بالکل سچ کہتی ہوں اس میں ذرا بھی شک نہیں کیونکہ میرے خاوند نے جو دوسرے دن صبح کو مچھلیاں مارنے گیا تھا میم صاحب کی لاش تیرتے دیکھ کر

پہچان لی تھی۔"

یہ قصہ لالہ نے ہمیں بعد کو بتایا تھا اور اس تذکرے کی مثال میں بتایا تھا کہ باتیں کیسی گڑھی جا رہی تھیں اور سچائی ایک زبان سے دوسری زبان پر پہونچ کر کس درجہ رنگ آمیز ہو جاتی تھی۔

اب ہم لالہ کے گھر میں چودہ پندرہ دن رہ چکے تھے انہیں کا کھانا کھاتے تھے لیکن ہمارے کپڑے پھٹ گئے تھے اور میلے ہو گئے تھے ہم انہیں کپڑوں میں بھاگے تھے جو پہنے ہوئے تھے کپڑے بدلنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا ضرورت یہ بھی تھی کہ ہم دیسی لباس پہن لیتے چنانچہ میری ماں نے کچھ کپڑے پھاڑ کر کرتیاں بنا دیں دو ایک لہنگے اور دوپٹے بھی خرید دیئے ایک انہوں نے خود پہنا اور ایک کو پھاڑ کر دو کرتے ایک میرے لئے اور ایک میری چچیری بہن کے لئے ایک لہنگا لنگا گم کا تھا اور دوسری موٹا گاڑھا سا تھی یہ موٹی قسم کے کپڑے تھے جو کا ٹھنیاں پہنا کرتی تھیں ان کپڑوں کو حسب ضرورت جب وہ بہت میلے ہو جاتے تھے ہم صحن میں دھو لیا کرتے تھے اور خشک ہو جاتے تھے کہ ہم پہن لیا کرتے تھے۔

یہ بھی ضروری تھا کہ اپنے آپ کو چھپانے کی خاطر ہم اپنے دیسی نام رکھ لیں ماں کا عیسائی نام "میری" تھا جس کا قدرتی ترجمہ "مریم" ہو گیا میرا نام خورشید اور میری چچیری بہن کا نام جو پستہ قد تھی "نہی" رکھا گیا میری ماں کے بھائی کا نام غلام حسین رکھا گیا ان کی ماں کو غلام حسین کی ماں اور دادی کو بڑی بی کہا گیا۔ یہ نام ہماری بدلی ہوئی پوشش کے مطابق ہو گئے اور ہمیں ہر لحاظ سے ایک مسلمان خاندان میں تبدیل کر دیا چونکہ ہم میں سے ہر ایک اردو زبان بہت اچھی طرح بول سکتا تھا اس لئے ہم بہت جلد دیسی زنانہ داری کی خصلتوں میں مل جل گئے جس کسی نے ہمیں پہلے لونڈیر کرتے ہوئے دیکھا تھا اب مشکل تھا کہ وہ ہمیں وہی لونڈیر ہونا سمجھ سکتا۔

لالہ کے گھر کی زندگی میں کچھ نہ کچھ تفریح بھی ہو جاتی تھی اسی گھر میں ہمارے ساتھ ایک عورت رہا کرتی تھی جس کا نام رتنا تھا وہ امرت لالہ کی بی بی تھی لالہ کی طرح امرت لال بھی کایستھ تھے۔ وہ پستہ قد اور قوی ساخت کے مرد تھے رتنا لالہ نے قد کی بدصورت عورت تھی ان دونوں سے لڑکیاں تھیں کوئی لڑکا نہیں تھا امرت لال کی آرزو تھی کہ ان کا وارث اور نام لیوا ایک لڑکا بھی ہوتا وہ کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے صرف عرضی نویسی ان کا ذریعہ آمدنی تھی وہ ستارہ شناس بھی تھے رفتہ رفتہ اتفاق یہ ہوا کہ ایک کہارن سے اُن کی آشنائی ہوگئی یہ کہارن ان کے ہاں پانی بھرا کرتی تھی اور انہیں کی طرح پستہ قد اور قوی تھی۔ وہ اس سے ہم بستر ہوئے اور دو لڑکے پیدا کیئے اگرچہ ان کی مراد بر آئی لیکن دو بیویوں کے لڑائی جھگڑے سے انہیں چین نہیں ملتا تھا۔ مزید براں ان کی آمدنی بھی بڑھے ہوئے خرچ کو پورا نہیں کر پاتی تھی انہوں نے ارادہ کر لیا کہ دونوں کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لئے کہیں باہر چلے جائیں بالآخر انہوں نے یہی کیا۔ ان کی عورتیں اکیلی رہ گئیں کچھ عرصہ تک وہ دونوں صلح جو رہیں اور ایک ساتھ رہتی رہیں۔ پہلی عورت سینے پرونے سے کما لیتی تھی۔ اس کی سوت پسائی کٹائی کر لیتی تھی کبھی کبھی ان کی رقابت بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ پہلی دھریا طعنے دیا کرتی تھی:

"من اُتری من اُتری۔ تو نے کیوں نہ جیتے جنے
میرے بھاگ پر کیوں جلتی ہے؟"

اب وہ اس کے سینے پرونے پر طعنہ زنی کرتی اور یہ کہنے لگتی:-

"ایسی ہی تیو نالی اور سینے پرونے والی تھی تو لالہ کو کیوں جانے دیا؟"

دوسری یہ شکوہ کرتی:-

"تو ایسی چنڈال آئی کہ لالہ بھی چلے گئے"

کبھی یہ طعنہ دیتی تھی:-

"جب تو پانی بھرا کرتی تھی تو تیرے ہاتھوں میں ڈھٹے
پڑ گئے تھے اب بینے کوٹنے سے تیری انگلیوں میں
ڈھٹے پڑ گئے۔ بتا اب کہاں کہاں ڈھٹے ڈالے گی؟"

امرت وال نے جوگ لے لیا تھا کہانت اور جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے ان کی خدمات کی خوب مانگ رہتی تھی آمدنی بھی زیادہ تھی فارسی کے اُستاد ہوتے ہوئے اور علم نجوم رکھتے ہوئے جو اس زمانہ میں عربی اور ہندوستانی مدارس میں زیر تعلیم تھا۔ لالہ امرت لال کو جھاڑ پھونک میں بہت مہارت ہوگئی تھی چونکہ انہوں نے گرہستی سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا وہ مفت خدمات انجام دینے لگے تھے اور بیشتر حصہ روپیہ پیسہ لینے سے انکار کر دیتے تھے ان کا پتہ لگا کر دمریا نے انہیں ایک خط لکھوایا اور میرے پاس پڑھوانے کو لائی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں لکھ پڑھ سکتی ہوں۔ خط کا مضمون یہ تھا :-

"اے ظالم! تو نے مجھے تل کے تیل کی طرح چھوڑ دیا
جو کھال میں جذب ہو کر خوشبو باقی چھوڑ دیتا ہے
تیری وہ گول مول صورت جو میری آنکھوں کے
سامنے گولے کی طرح ہوا میں ناچتی ہے اور تیری گول
آنکھیں جو اگر قریب ہوتیں تو یہ محبت نامہ لکھاتے وقت
مجھے گھورتی ہوتیں۔ کیا تو اب بھی عورتوں کو بے وفائی
کا طعنہ دے گا حالانکہ یہ خط تیری نہ ختم ہونے والی
محبت کی شہادت ہے، تو مجھے "لاڈو" کیوں کہا کرتا تھا
جب تجھے کچھ بھی میری محبت نہیں تھی اور تو نے مجھے
اپنی لکڑی جیسی عورت کے طعنے تشنیع سننے کے لئے
کیوں چھوڑ دیا اگر میں "لاڈو" تھی تو میرے جذبات
سے اس طرح کیوں کھیلتا، اب بتا کہ تو جھوٹا نکلا
کہ میں؟ یا تو چلو بھر پانی میں ڈوب مر یا واپس آ کر
میری سوت کو گلے کا ہار بنا لے یا اس کی مورتی نو
پھیروں میں اپنے بازو پر باندھ لے تا کہ تیری محبت
کا جادو مجھ سے دور ہو جائے۔"

اس دل فریب خط کا جواب جو اُسے ملا وہ صرف ایک شعر تھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"جب میں نے ناکارہ اور ناہنجار دُنیا سے قطع تعلق
کر لیا تو میرے لئے نہ افسوس کا کوئی مقام نہ غم کی
کوئی حقیقت ہے نہ محبت ہی مجھ پر اثر کرتی ہے نہ
کلفت کا مجھے کوئی خوف ہے۔"

(۳۴)

باغی حکومت

میں عرض کر چکی ہوں کہ باغیوں نے ۱۳ مئی ہی کو سبز محمدی جھنڈا لگا دیا تھا برطانوی جھنڈے کے برعکس وہ جور و ظلم کا نشان ثابت ہوا۔

ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک قوی ہیکل کلوار بہادر گنج میں ایک کنجڑے سے آم خریدنے آیا مگر نرخ بازاری سے بہت کم قیمت دینا چاہتا تھا کنجڑے نے کہا اگر کہیں بھی تمہیں اس سے کم پر مل جائیں تو جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرنا!

گاہک نے برہم ہو کر کہا :-

"اچھا اگر تو ایک پیسہ کے ایک دو بیسی (۱۲۰) آم نہیں دیتا ہے تو میں یہ کروں گا" اور اس نے ڈرانے کے لئے اپنی لاٹھی اٹھائی کنجڑا اڑ گیا اور حسب عادت چلایا "مجھ لوٹ لیا۔ لوٹ لیا" کلوار ذرا بھی نہیں جھجکا۔ کنجڑے کو اٹھا کر دے مارا اور سینہ پر سوار ہو کر دانت سے اس کی ناک صاف کر دی لوگ جمع ہو کر تماشہ دیکھنے لگے کسی نے مداخلت کی جرأت نہیں کی نہ ہی حملہ آور سے کچھ کہا جو اس بزدلانہ زیادتی کے بعد

ڈگری کے سب آم لے کر چلتا بنا کنجڑے نے جا کر نواب سے استغاثہ کیا! لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

خود نواب کے ظلم و تعدی کی مثال یہ بیان کی گئی۔

قادر علی خاں نے جب وہ معمولی حیثیت کے تھے اپنے کچھ جواہرات ایک سنار کے پاس گرو رکھے تھے اب کہ وہ حکمراں ہوئے انہوں نے سنار کو بلا کر کہا کہ جواہرات واپس کردے۔ سنار نے کہا "آپ فک رہن کرا لیں" اس پر نواب برہم ہوگئے اور سنار کے گھر ایک دستہ فوج کا روانہ کیا وہ گھر میں گھس گئے اور نہ صرف جواہرات برآمد کر لئے بلکہ ان کے علاوہ جو کچھ گھر میں تھا سب لوٹ لیا۔

اس طرح منظم حکومت کا قطعی خاتمہ ہو چکا تھا عوام اپنی جان و مال کے لئے لرزاں رہتے تھے اُن بھانسیوں اور مظالم کی جو روزانہ ہوا کرتے تھے کوئی اپیل بھی نہ تھی اس حکومت کے خلاف سرکشی کرنیوالا صرف ایک گروہ چند مواضعات کے راجپوتوں کا تھا وہ نہ صرف مالگزاری ادا کرنے سے انکاری تھا بلکہ وہ لوگ دارالسلطنت پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے اُن کے خلاف نظام علی کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی گئی جس نے حملہ کر کے انہیں شکست دی اور تین سر لا کر منظر عام پر دوسروں کی عبرت کے لئے لٹکا دئیے راجپوت اگرچہ مغلوب اور منتشر کر دیئے گئے تھے وہ پھر مسلح ہو گئے اور شہر پر حملہ آوری سے ڈراتے رہے۔

نواب قادر علی خاں کی حکومت روز بروز زوال پذیر ہو رہی تھی اکثر نمایاں خاندان ان سے کنارہ کش تھے جنہیں راضی کرنے کی نواب نے کوئی تکلیف گوارا نہ کی۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ خزانۂ عامرہ میں روپیہ بالکل نہیں تھا جس سے حکومت چلائی جا سکتی جو روپیہ سرکاری خزانہ سے ہاتھ لگا وہ باغی سپاہی لے بیٹھے گئے کوئی آمدنی مالگذاری سے بھی نہیں ہو رہی تھی جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق تھا اگرچہ نام کو عدالتیں تھیں مگر لوگ عدالتوں میں جانے سے احتراز کرتے تھے ان مثالوں نے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے لوگوں کے دلوں میں عدالت جانے کے نتائج کا خوف پیدا کر دیا تھا۔

(۳۵)

فرحت بنام زینت

اری مُوت یا! کیا اُنہیں کا کہہ رہی ہے؟

اوئی بی! اپنے مرکی قسم میں جھوٹ کیوں کہنے لگی؟

اچھا۔ بتا کون لایا ہے میں اُسے انعام دوں؟

چھوٹی بی! بیکار نہ فرمایئے قادری نائن لائی ہے گھونگٹ کے پیچھے سے اُس نے میرے ہاتھ میں دے دیا کہیں ایسی بے احتیاطی نہ کیجئے گا کہ اُن سے اس کا ذکر کر بیٹھیں اگر آپ کو انعام ہی دینا ہے تو آپکی وفادار ہوں سیا کیوں بھلا دی جائے!

پہلی ملاقات کے بعد جس کا ذکر کیا جا چکا ہے یہ دلدادگان طرف ایک مرتبہ اور ملے تھے اور وہ بھی بہت مشکل حالات میں زینت کو جو خط ملا وہ فرحت کا تھا زینت ماں کی نظر بچا کر چھت پر چلی گئی ڈوبتے سورج کی دُھندلی روشنی میں اُس نے یہ خط پڑھا۔

فرحت بنام زینت

نامہ تو کوئی روز کا لکھا تھا ولیکن کرتا نہ تھا اس وجہ سے قاصد کے حوالے
یہ دیدہ نادیدہ رہے دید سے محروم اور حال خط آنکھ رُخ یار پہ ڈالے

جب میں ایام طفولیت یاد کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگیوں کا بہترین زمانہ وہی تھا اُس وقت تمہارے لئے ضروری نہیں تھا کہ پختہ دیواروں کی آڑ میں میری نظروں سے پنہاں رہو نہ کسی کو ہمارے غیر مناسب طریقے پر کوئی شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ میں ابھی تیرھویں سال میں تھا اور تم ایک معصوم و بے قصور لڑکی تھیں ہمارے دلوں میں محبت نے استحکام نہیں پایا تھا تمہاری غزالی آنکھیں نہ ایسی سیاہ اور دور رس تھیں کہ جو کوئی تم پہ نظر اُٹھاتا وہ امید و تمنا کے دام میں گرفتار ہو جاتا تمہاری

آنکھوں میں وہ کمالِ حسن اور اثر نہیں تھا جو اب ہے تمہارے گلابی رخساروں میں جن کے سامنے پھول بھی حقیر و شرمندہ ہو جاتے ہیں اب جیسا رنگِ شباب نہیں تھا نہ ہی تمہارے انداز میں وہ قوت دلگیری تھی جس کا اثر اب ہر ایک دل محسوس کرتا ہے یہ سب انداز بدل گئے محبت اب ہم دونوں کے دلوں پر حکمراں ہے ہم دونوں کی یہی آرزو ہے کہ باہم ملتے اور باتیں کرتے اور جب تم میرے بازو پر جھکی ہوئی اپنی نظریں اٹھاتیں جن سے میرے ہوش و حواس بے قابو ہو جاتے تو میری یہی تمنا ہوتی کہ میں تمہیں دیکھتا رہوں اور اس وقت تک دیکھتا رہوں جب تک ہماری روحیں باہم متوصل نہ ہو جائیں اور ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ دنیا کی اب ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ ہائے وہ ایامِ عیش کبھی واپس نہیں آئیں گے!

ہماری چوری چھپے کی ملاقات ہماری مسرتوں کو اور بھی بڑھا دیتی تھی اب ایسے نصیبوں کی امید کہاں؟ ایک طرف تو میری آزادی پر ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ میں کسی بہانہ سے بھی گھر کے باہر نہیں جا سکتا۔ دوسری طرف ہم دونوں کے والدین کے درمیان جو ناخوشگوار اختلافات ہیں ان سے خوف ہے کہ دونوں گھرانوں میں آنا جانا بالکل منقطع ہو جائے گا میرے والد برسرِ حکومت ہیں وہ اپنے تمام اختیارات میری تمناؤں اور محبت کو فنا کرنے میں صرف کر رہے ہیں لیکن نہ تو وہ تمنا کو میٹ سکتے ہیں اور نہ محبت کو فنا کر سکتے ہیں برخلاف اس کے جیسا وہ کہتے ہیں میرا جنون روز بروز ترقی پر ہے مثل اس دریا کے جو آہستہ روی سے بہتا ہے لیکن رکاوٹ ڈالنے سے اپنی پوری قوت اُسے دور کرنے کے لئے جمع کر کے تیز و تند ہو جاتا ہے اسی طرح اے زینت! تجھے حاصل کرنے کی آرزو روز بروز قوی اور خوفناک ہو رہی ہے۔

میں ایسا قدم اُٹھانے والا ہوں جو سب کو حیرت زدہ کر دیگا مگر خوف ہے کہ اگر آزادی نہیں تو تیری نیک نامی پر ضرور اثر پڑے گا۔

زینت: تو چودھویں رات کے چاند اور صبح کے ستارے سے حسین تر ہے جو نام اب تک ہمارے لئے جاتے ہیں کیا ان کے علاوہ دوسرے ناموں سے پکارے جانے کی امید ہم ترک کر دیں؟ کیا ہماری قسمت میں ایسی شام نہیں جب ہم ساتھ ساتھ کھڑے ہوں ہماری تمنائیں پوری ہوں اور ہات میں ہاتھ ڈالے سفرِ زندگی طے کرتے ہوں؟ نہیں نہیں! اُس محبت کی قسم جو تجھ سے ہے اس غیر یقینی صورتِ حال کا خاتمہ ہو گا لوگوں کے بقول میرا مرض روز بروز ترقی پر ہے، دردِ دل نے میری روح کو تحلیل کر دیا ہے اور اگر تو میری مسیحا جلد چارہ گری نہیں کرے گی تو میری زندگی کا بہت جلد خاتمہ کر دے گا میں تجھ ہی سے اچھا ہو سکتا ہوں قدرت نے اس کا اور کوئی علاج ہی نہیں رکھا ہے اور نہ ہی جنت میں اس سے بہتر کوئی علاج پیدا ہوا ہے۔

میری زینت! کیا تو ایسی جرأت کے لئے تیار ہو جائے گی؟ والدین کا گھر چھوڑ۔ اپنی عافیت و آبرو میرے سپرد کر شہر چھوڑ کر میرے ساتھ کسی ویرانے میں چل دے جہاں تیرا عاشق اپنی بقیہ زندگی تیرے ساتھ بے فکری قناعت اور مسرت سے گزار سکے یہی ایک سبیل ہے جس سے ہماری آرزو کی تکمیل ہوگی اسی طریقہ سے ہماری پرسکون زندگیاں مداخلت سے محفوظ رہیں گی اسی تحریک سے ہم دنیا والوں کو جو ہماری محبت کے درپئے تخریب ہیں شکست دیں گے اور اللہ کی رحمت کے خواستگار رہیں گے جو اُن دلوں پر نظرِ کرم فرمائے گا جنہیں اُس نے عالمِ بالا میں ایک کیا تھا اور جنہیں ہمارے عزیز و اقربا بے رحمی سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔

زینت! تو کانپ رہی ہے! تیرے اعضا لرزاں ہیں۔ تو اس تجویز پر تعجب کر رہی ہے۔ پیاری زینت! ذرا سکون سے کام لے دیکھ! ہمیں جری اور حوصلہ مند ہونا چاہئے کہ ہمت ہی فتحیاب ہوا کرتی ہے۔

اے میرے عشق و محبت کی لازوال نشانی وہ آہ جو میرے دل سے نکل رہی ہے محبت کی بجلی کی طرح میرا پیام بے زبانی تجھ تک

پہنچائے گی جو میرے آنے کی منتظر ہوگی۔

(تیرا شیدائی فرحت)

(۳۶)

زینت بنام فرحت

زینت کو خط پڑھنے میں اندازہ سے زیادہ وقت لگا خط کو بوسے دئے ہر صفحہ کو لوٹ لوٹ کر چوما خط پڑھتے ہی اُس کے جذبات مشتعل ہو گئے آخری حصہ نے اُس کے دل کو حسرات سے بھر دیا۔

اس کے غم زدہ دل میں خیالات کا ہجوم ہو گیا گزشتہ اور آئندہ کے خیالات میں محو ہو کر وہ جس سیڑھی پر بیٹھی تھی وہیں سو گئی ہوشیا کی آواز سے وہ چونک پڑی۔ اُس نے پکار کر کہا "چھوٹی بی! آپ کہاں ہیں؟ کیا ابھی تک آپ اپنے کرنے سے کپڑا نہیں نکال پائیں؟ بی بی پوچھتی ہیں کب تک بستر پر آؤ گی؟"

زینت نے یہ بیش بہا کاغذ کا پرچہ اپنے سینہ میں چھپا لیا اور سونے چلی گئی دل میں کہہ رہی تھی کاش! یہ گلاب کا پھول ہوتا اور ہمیشہ میرے سینہ سے لگا رہتا۔

اس کی نیند کم اور تشویشناک تھی یکایک اُس کی آنکھ کھل گئی اُسے محسوس ہوا کہ اس کا شیدائی اُس پر سوتے ہیں بوسہ لینے جھکا ہے فوراً خیال آیا کہ یہ تو وہم و خواب ہے دل ہی دل میں کہنے لگی پیاری نیند! تو اسی صورت کے ساتھ ہمیشہ آیا کر کہ خواب کا کوئی گواہ نہیں ہوتا اور ایسی خواب کیسی مسرت انگیز ہوتی ہے اس سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے بے شک میں حظ حقیقی سے متاثر ہو رہی ہوں اور رات بھر اس مسرت میں محو رہوں گی حیف کہ یہ خوشی عارضی ہے پھر بھی کتنی خوش ہو ہو کر میں اسے یاد رکھوں گی ہائے رات تیز رفتار ہو گئی ہے میری مسرت کا خاتمہ کرنے والی ہے!

ابھی دن نہیں نکلا تھا کہ زینت افسردہ دلی کے ساتھ اُٹھی اس نے عزم کر لیا کہ اگر حالات اُسے جنبشِ لب کی اجازت نہ بھی دیں تو وہ تحریری جواب سے اپنے جذبات اور ارادہ کا اظہار کرے گی وہ چپکے سے اپنے کمرہ میں چلی گئی اور کانپتے ہاتوں سے لکھنا شروع کیا اس کے سیدھے ہات میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں سادہ کاغذ تھا جو اس کے معصوم دل کی طرح صاف وشفاف تھا اس نے لکھنا شروع کیا پھر تامل کیا پھر لکھا اور صحیح کیا نشان بنائے اور شادیئے مضمون بدلا مسترد کیا اور پسند کیا ایک مرتبہ اس نے پھینک دیا اور پھینک کر پھر اُٹھا لیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھے الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے تھے مگر ضبط تحریر میں لاتے ہوئے اُسے دشواری ہو رہی تھی اس کا مجروح دل اس کا زرد چہرہ اُس کی افسردگی اس کی نیچی نظریں اس کی آنسو بھری آنکھیں اس کے بوسے اُس کی ہم کناریاں اور اُس کے تمام جذبات اُمنڈ آئے اُس نے خیال کیا کہ تعجیل کی ضرورت ہے ورنہ صبح ہوتے ہی سارا گھر جاگ اُٹھے گا آخر کار اُس نے لکھا:۔

مَیں اپنی محبت کی کہانی دل کی دُکھن کسے بتاؤں میرا کوئی ہمراز میرا کوئی مخلص نہیں۔

مرت تیری یاد میرے ساتھ اور دلِ حزیں میرا غمگسار ہے۔

تو ہی دلِ مضطر کی مسرت ہے میری آرزو کا آفتاب میری زندگی کے طوفانی سمندر کا قطب ستارہ ہے جو میرے کمزور وجود کی رہنمائی کرتا ہے میرے انجم شب میرے الماس سحر!

تیرا خط ملا جس نے پیام بہشت بریں کی طرح سکون پہنچایا کاش! میں روزانہ۔ ہر لحظہ نہیں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے تیرے پاس ہوتی تب ہی تیرے مَس سے دلِ حزیں کو راحت ملتی اور دھڑکن کو افاقہ ہوتا۔

پیارے! تجھے کیا معلوم کہ مجھے تجھ سے کتنی اور کیسی محبت ہے میرے

افعال واقوال پر کڑی نگرانی ہو رہی ہے میرے والد اپنی خود خواستہ
جلاوطنی سے واپس آنے والے ہیں اس سے مجھے اور بھی فکر ہو گئی ہے
کیونکہ اگر انہیں ہمارے تعلقات کا علم ہوا تو وہ ناراض ہو کر جملہ ذرائع
آمدورفت مسدود کر دیں گے تمہارے خط کی تجویز پہلے ہی میرے ذہن
میں تھی مگر میرا رویہ۔ میری نیک نامی اور ذاتی خطرات مانع تھے اب
میرا غم خوردہ دل موجودہ زندگی سے تنگ آگیا ہے میں فرقت
برداشت نہیں کر سکتی۔ مقید ہوں تیری محبت میں گرفتار رہوں اور یہ
زنجیر میں خوشی سے ڈالے ہوں۔ اے بادِ صبا! اب مجھے بوئے گلاب
کی طرح جدھر چاہے لے چل میں اپنا سب کچھ تیرے حوالہ کرتی ہوں

تادمِ مرگ تیری زینت

زینت نے خط بند کر کے سر بمہر کیا اور جیسے ہی ہو سکا
یہ کہنے آئی کہ آپ کے چھوٹے بھائی اُٹھ بیٹھے ہیں اور گھوڑا منگا یا ہے
زینت نے خط اس کے ہاتھ میں دے دیا اور بستر پر چلی گئی۔

(۳۷)

مِس لوئٹر کا بیان۔ خانگی کفایت شعاری

غالباً میں ذکر کر چکی ہوں کہ ہمارا کھانا لالائن پکایا کرتی تھیں
ہندوؤں کے غریب اور اوسط گھرانوں میں فرضِ خانہ داری بیوی کے
سپرد رہتا ہے بالخصوص جب گھر میں ساس یا نند ہوا کرتی ہے تو
باورچی خانہ کا کام کاج بزرگوں کی اطاعت ظاہر کرتا ہے حالانکہ وہ
بہو یا دُلہن کے لقب سے ممتاز رہتی ہے۔

جب وہ کام میں لگتی ہے تو کپڑے اُتار کر ساڑی پہن لیتی ہے
جو ساڑھے چار سے بارہ گز تک لانبی اور ڈیڑھ گز چوڑی ہوتی ہے
اسے کمر کے گرد لپیٹ کر سامنے گرہ لگا دیتے ہیں باقی حصہ ساڑھی کا
جسم پر ڈال کر دوسرا پلو دوپٹہ کی طرح کاندھے پر ڈال لیتے ہیں مشرقی
حصۂ ہندوستان میں عورتوں کی یہی پوشش ہوتی ہے خوشحال گھرانے
بہت خوبصورت ساڑھیاں پہنتے ہیں جس سے کل جسم چھپ جاتا
ہے ساڑھی سوتی۔ ریشمی دونوں قسم کی ہوتی ہے اور قیمت میں
ایک روپیہ سے پچاس روپیہ تک ہوتی ہے۔ بنارس کی کناری دار
ساڑھیوں کی قیمت فی ساڑھی پانچسو روپیہ تک ہوتی ہے۔

باورچی خانہ میں چوکا۔ چولھا اور برتن ہوا کرتے ہیں چوکے کا
رقبہ قریب قریب چار فیٹ مربع ہوتا ہے یہ برآمدے یا کوٹھری کے
ایک گوشہ میں ہوتا ہے کہیں کہیں اس میں پانچ چھ انچ اونچی
خوشنما منڈیر بھی بنائی جاتی ہے اور یہ سب مٹی اور گوبر سے گھر
کی بیوی اپنے ہاتھ سے بناتی ہے اندرونی سطح بھی اسی طرح
مٹی اور گوبر ملا کر لیپی جاتی ہے کھانا پکانے سے پہلے اس
سطح کو روزانہ پوتنی مٹی سے پوتا جاتا ہے کھلے برتن میں مٹی
گھول دی جاتی ہے ایک پرانا کپڑا لے کر بیوی اُسے برتن میں
ڈبوتی اور سطح پر پھراتی جاتی ہے۔

جب تک وہ تھالیاں برتن سنبھالے ترکاری کاٹے
یا دال صاف کرے زمین پیر رکھنے کے لئے کافی خشک ہو جاتی
ہے پھر وہ ننگے پیر چوکے میں جاتی ہے اور لکڑیوں کی چپڑیوں
یا کنڈوں سے چولھے میں آگ جلاتی ہے جو مٹی سے اس طرح
بنا ہوتا ہے کہ صرف سامنے کا حصہ کھلا چھوڑا جاتا ہے چولھے پر
دال چڑھا کر بیوی تھالی میں آٹا گوندھنے لگتی ہے کچھ دیر بعد
تھوڑے تھوڑے وقفہ سے لکڑی یا پیتل کی ڈوئی سے دال چلاتی
جاتی ہے دال صرف پانی میں پکائی جاتی ہے کھاتے وقت
اس میں گرم گھی ڈال لیا جاتا ہے ترکاری خاصکر تیل میں پکائی
جاتی ہے بعض نفاست پسند گھی کو ترجیح دیتے ہیں کاٹھوں
کے گھروں میں بکری کا گوشت بھی بالعموم لذائذ میں ہوتا ہے

لیکن ہم نے شاید ہی کبھی چکھا ہو جب دال پک جائے ہانڈی اُتار لی جاتی ہے اور لوہے کا توا چولھے پر چڑھا کر روٹی پکائی جاتی ہے جس میں، عام طور پر خمیر نہیں ہوتا حالانکہ کبھی کبھی روٹیاں پر گھی چپڑا جاتا ہے جو فضول خرچی متصور ہوتی ہے۔

گھر کے مرد کو کھانا کھلا کر عورتوں کو دیا جاتا تھا۔ انہیں میں ہم بھی تھے ہم اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں کھانا کھایا کرتے تھے دوسری عورتیں ساڑھیاں پہنے چوکے میں داخل ہو کر بیٹھ جاتیں وہ پیتل کی تھالیوں میں کھایا کرتی تھیں جب کھا چکتے تو حسب دستور مٹی یا بیسن سے ہات دھوئے جاتے جس سے چکنائی بالکل دور ہو جاتی اور ہات میل کچیل سے صاف ہو جاتے۔

ایک دفعہ پڑوس کے کائتھوں میں رت جگا ہوا اور ایک ڈلیا مٹھائی کی لالہ کے گھر آئی جس میں سے ہمیں بھی حصہ ملا۔

رت جگا دراصل مستورات کی رسم ہوتی ہے بعض مقامات پر اسے "کھوریا" بھی کہتے ہیں مثلاً بیٹے کی شادی کے موقع پر جب مرد بارات لے کر جا چکتے ہیں تو اعزا اور احباب کی عورتیں دولھا کے گھر مبارکباد دینے جمع ہوتی ہیں تب رت جگا یا رات بھر جاگنے کی رسم ادا کی جاتی ہے پوری رات گانا اور کھانا پینا ہوتا رہتا ہے عورتیں گھیرا باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں انہیں میں سے ایک ڈھولک بجاتی اور سب کی سب گانے لگتی ہیں ڈھولک کے دونوں طرف متواتر تھاپ لگا کر لے قائم رکھی جاتی ہے۔ ڈھولک لکڑی کا گول پیپا سا ہوتا ہے اس کے خلا کو ہر دو جانب بکری کی کھال سے منڈھ دیا جاتا ہے جسے "پڑا" کہتے ہیں لکڑی کے کناروں پر چمڑا لگا دیتے ہیں ایک ڈوری سے دونوں کمنیں ملا دی جاتی ہیں یہ ڈوری بشکل مثلث ایک طرف سے دوسری طرف ڈالی جاتی ہیں پیتل کے چھلے ان مثلثوں میں ڈال دیتے ہیں اور انہیں کے ذریعہ پڑے کو مطلوبہ آواز کے مطابق کس دیا جاتا ہے اور ایک ڈوری دونوں کناروں سے باندھی جاتی ہے تاکہ ڈھولک گلے میں ڈال لیں یا گھٹنوں سے لگا لیں گھٹنا ڈھولک پر جما رہتا ہے ہاتھ کی پہلی دو تین انگلیوں سے ڈھولک کو دونوں طرف بجایا جاتا ہے سیدھے ہات سے سیدھا پڑا جس سے آواز نکلتی ہے اور الٹے سے "تھاپ" لگائی جاتی ہے زیادہ سخت آواز نکالنے کے لیئے الٹے ہات کے "پڑے" کے بیچ میں مصالحہ لگایا جاتا ہے بیرونی حصہ آٹے سے نرم رکھتے ہیں یہ کام زیادہ تر "طبلہ" میں کیا جاتا ہے نہ کہ ڈھولک میں۔

ان مواقع پر جو گیت گائے جاتے ہیں وہ عورتوں کو خوب یاد ہوتے ہیں یہ گیت ایسے ہوتے ہیں جو مرد شاذ و نادر ہی گاتے ہونگے انہیں رت جگے کے گیت کہا جاتا ہے یہ سادہ دیہاتی شوخ اور خوشی کے نغمے ہوتے ہیں جنہیں سب ایک ساتھ مل کر خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچاتی ہیں یہ آوازیں مہذب اور تعلیم یافتہ کانوں کو ناگوار ہوتی ہیں بہر حال گیت دیہاتی گانا سمجھنے والوں یا ان لوگوں کو جو مواضعات کی دیسی زندگی میں داخل ہو کر رہے ہوں خوش کر دیتے ہیں۔

گانا ہوتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چند مہان گلگلے بنانے میں لگ جاتے ہیں یہی رت جگے کا خاص پکوان ہوتا ہے ایک کڑھائی آگ پر رکھ کر اس میں گھی ڈال دیا جاتا ہے جب گھی خوب گرم ہو جائے تو میدے اور پسی ہوئی شکر کا چھوٹا سا جز اس میں ڈال دیا جاتا ہے جو گھی میں پہنچ کر گیند کی طرح پھول جاتا ہے جب پک جائے تو سوراخ دار ڈوئی

ہیں لے کر نکال لیتے ہیں اور دوسرا ڈال دیتے ہیں طریقہ یہ ہے کہ ایسے کئی جُز علیٰحدہ علیٰحدہ ایک ساتھ ڈال دیتے ہیں۔ گلگلے تیار ہو کر ڈلیا میں رکھ کر چھپا دیتے ہیں تاکہ سخت نہ ہونے پائیں صبح کو اعزا واحباب میں بھیج جاتے ہیں یہ بڑے شوق سے کھاتے جاتے ہیں کیونکہ ایسی رسم ہمیشہ نہیں ہوا کرتی۔

(۳۸)

مسز لوئیٹر کا بیان۔ "رسوم خانگی"

چونکہ میں نے ہنود کے رت جگے کا ذکر کیا ہے لہٰذا مزید بیان سے قبل مجھے چاہیئے کہ میں مختصر حال اس رواج کا جو مسلمانوں میں قائم ہے اپنے ذاتی تجربہ سے عرض کردوں۔

یہ رسم بالعموم بچہ پیدا ہونے پر دوسرے "چھلے" میں خوشی کے نام سے ہوتی ہے جب بیٹا پیدا ہو تو ماں یعنی "زچہ" کی رشتہ دار مستورات گھر پر اگر "چھٹی" کی رسم ادا کرتی ہیں جو یوم پیدائش کے چھٹے یا ساتویں روز ہوا کرتی ہے چھٹی کے بعد ماں بستر سے اُٹھ کر نہا ڈالتی ہے شادی کے موقع پر شادی سے قبل والی رات کو "رت جگا" ہوتا ہے ایک اور رت جگا دوسری خوشی کی رسم کے بعد والی رات کو ہوتا ہے

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے عورتیں گھیرا باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور ڈھولک کے ساتھ گاتی ہیں مسلمان عورتوں میں بمقابلہ ہندو عورتوں کے آواز اور خوش گلوئی کی زیادہ کچھ بوجھ ہوتی ہے اگرچہ ناچ کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور عام طور سے ناچتی نہیں ہیں تاہم کوئی شوخ عورت بعض اوقات مجبور کئے جانے پر مجمع سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کچھ ناچ لیتی ہے اُسے دیکھ کر دوسری [illegible] ٹھ کر کہتی ہے تم ٹھیک نہیں ناچیں دیکھو ایسے ناچتے ہیں در اصل ناچ کے متعلق ان کی کوشش نا موزوں اور بھدی ہوتی ہے دیکھنے والے ہنس دیتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ناچ کا فن صرف پیشہ ور یا "کسبی" مرد عورت کے لئے مخصوص ہوتا ہے مالدار گھرانوں میں رت جگے میں گانے کا کام ڈومنی انجام دیتی ہے ڈومنی یا "ڈومن" پیشہ ور ناچنے والی ہوتی ہے وہ "کسبی" سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ وہ صرف زنانہ جلسہ میں ناچتی ہے اور زنان خانہ کے اندر ہی رہتی ہے۔

برعکس رنڈی کے اس کے ساتھ بجانے والیاں بھی عورتیں ہوتی ہیں جن کی تعداد چار ہوتی ہے دو سارنگی ایک طبلہ یا ڈھولک اور ایک مجیرا بجاتی ہے مردوں کے برعکس یہ سب بیٹھ کر بجاتی ہیں ڈھولک بجانے والی "تھاپ" کے لئے بایاں اور آواز کے لئے ڈھولک کا دایاں نصف حصہ بجاتی ہے ناچنے والی حلقہ میں کل اہل مجلس کے سامنے ہو کر گذرتی ہے جب بیٹھ کر گائیں تو چار پانچ مل کر گاتی ہیں اور انہیں میں بیٹھ کر بجانے والیاں ساتھ دیتی ہیں ان مواقع پر وہ فرش کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر گاتی ہیں۔

گانا ہوتا جاتا ہے کہ اسی دوران میں وقتاً فوقتاً پان دیئے جاتے ہیں سننے والیاں اگر کوئی اچھا گانا ہوا تو گانے والیوں کی تعریف کرتی ہیں اور بعض خوش ہو کر روپیہ دو روپیہ دے دیتی ہیں اسے "بیل" کہتے ہیں۔ گانے والی لے کر بجانے والی اُستاد کو دے دیتی ہے اور دینے والی کو جھک کر سلام کرتی ہے۔

"رت جگے" کے پکوان میں گلگلے اور رحم ہوتا ہے جس کی مقدار سویّے اور ڈیڑھ میں ہوتی ہے یعنی آٹا

سوا یا ڈیڑھ سیر، سوا یا ڈیڑھ من یہ مقدار کوئی پورا عدد یا عدد کا کوئی جزو نہیں ہوتی اگر پکانے کی مقدار کم ہوتی ہے تو نائن کی مدد سے عورتیں خود پکا لیتی ہیں لیکن جب منوں میں ہو تو مالک مکان مردانے میں بالعموم نائی سے پکوا دیتے ہیں بعض اوقات گلگلے کھوپرے کے برابر ہوتے ہیں۔" رحم" پسے ہوئے چاولوں کا ہوتا ہے۔ یہ چاول دودھ اور شکر میں گوندھ کر اس میں کچا گھی ملایا جاتا ہے اوپر سے خشک میوہ یعنی کشمش، پستے بادام اور چرونجی ڈال کر سب کو خوب ملا دیا جاتا ہے گولے اتنے بڑے بنائے جاتے ہیں جو ہات میں آ جائیں۔ یہ ایک قسم کی گاڑھی فیرینی ہوتی ہے جو بے ترتیب گولوں کی صورت میں تشکیل کر دی جاتی ہے۔

ان پکوانوں میں سے اُس وقت تک کچھ نہیں کھایا جاتا جب تک صبح کو قریب کی مسجد میں نہ بھیجدیا جائے گھر کی مالکہ لے جانے والے کو یہ ہدایت کرتی ہے:-

"میں نے خدا کا رت جگا مانا تھا یہ اللہ کے
نام کا لے جاؤ اور طاق بھر آؤ۔"

لے جانے والا یہی کرتا ہے اور جتنا بھی طاق میں آئے اُسے بھر دیتا ہے مسجد کا مُلا اُسے لے کر اپنے گھر صرف میں لاتا ہے اور اُن غریبوں کو جو خبر پاکر جمع ہو گئے ہوں جی چاہے تو کچھ دے دیتا ہے۔ جب یہ فرض ادا ہو جائے تو مہمان حصّہ لیتے ہیں اور اُن اعزا و احباب کے گھروں پر بھیجتے ہیں جو غیر حاضر رہے ہوں۔

جب خدا کوئی منت پوری کرتا ہے تو اُس کے شکرانے میں بھی رت جگے منائے جاتے ہیں مثلاً کوئی منت مانی "اگر اللہ ایسا کر دے۔ یا میری آرزو پوری ہو جائے تو میں اللہ کے نام کا رت جگا (خدائی رات) کروں گی۔" جب یہ منت پوری ہو جائے تو ایفائے منت میں مذکورہ بالا طریقہ پر رت جگا کیا جاتا ہے۔

رت جگا ہمیشہ خوشی کا موقع ہوتا ہے اور گھر کے کسی خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے مسلمان گھرانوں میں فضول حیلوں بہانوں سے یہ رسم نہیں منائی جاتی نہ ہی عورتوں کو جمع کرنے یا گانا بجانا سُننے کے لئے یا ایک گھر کی عورتوں کو دوسرے گھر والیوں میں بلانے کے لئے یہ رسم بر سر کار لائی جاتی ہے۔

ناظرین نے دیکھ لیا ہوگا کہ رت جگا ایک قسم کی مذہبیت لئے ہوتا ہے یہ پکے پکائے کھانے کا خیراتی کام ہوتا ہے گھریلو مستورات کی خیرات کے اور طریقے بھی ہوتے ہیں جو بیان کروں گی۔

(۳۹)

مس لوئیٹر کا بیان۔ دیگر رسوم خانہ داری

ایک اور قسم کی خیرات ہوتی ہے جسے "بی بی کا کونڈا" "بی بی کی سینک" یا "بی بی کا دانہ" کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی کسی بخشش کے شکرانے یا کسی منت کے پورا ہونے میں کیجاتی ہے گھر کی مالکہ میٹھے چاول پکواتی ہے جب تیار ہو جائیں تو کورے کونڈے یا مٹی کے نئے برتن میں بھر دیتی ہے گھی کترا ہوا میوہ دودھ اور بالائی اوپر سے ڈالی جاتی ہے پھر فاتحہ ہو کر کسی ڈلیا سے ڈھک کر علٰحدہ رکھدیا جاتا ہے یہ کونڈا پہلے ہی سے جا چکا ہوتا ہے اور یہ مہمان سب کی سب مستورات ہی ہوا کرتی ہیں یہ کونڈا معمولی عورتوں کے لئے ہرگز نہیں ہوتا اُسے میزبان کی صرف ملنے والیاں۔ رشتہ دار۔ یا سیدانیاں ہی کھا سکتی ہیں۔ یہ کونڈا یا پنج

سات یا اس سے زیادہ طاق عورتوں کی تعداد کے سامنے رکھدیا جاتا ہے لازم ہوتا ہے کہ یہ مہمان اپنے شوہروں کی اکیلی یعنی صرف ایک میاں بی بی او۔ سہاگن ہوں نیز وہ سخت پردے میں رہنے والیاں ہوں جنہیں چھ برس سے زیادہ عمر والے غیر لڑکے نے کبھی نہ دیکھا ہو اور جو پنج وقتہ نماز پڑھا کرتی ہوں ترشدار اور ملنے والیوں کی عدم دستیابی پر کہ اُن میں پانچ سات ملنا مشکل ہوتا ہے اُن کی جگہ ایسی تعداد میں ایسی سیدانیاں بلائی جاتی ہیں جن میں مذکورہ بالا خصوصیات موجود ہوں یہ مہمان عورتیں دن میں نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر آتی ہیں اُن کے سامنے کونڈا رکھدیا جاتا ہے یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسی عورتیں چوبیس گھنٹے قبل سے کوئی غذا نہیں کھاتی ہیں اس لئے اچھی بھوک کے ساتھ بیٹھ جاتی ہیں اور ایک ہی رکابی میں سب کھانے لگتی ہیں جب انہیں رخصت کیا جاتا ہے تو بطور رسم انہیں چیاغی یا نذرانہ نقد بھی دیا جاتا ہے کبھی دوپٹہ کے کنارے پر روپیہ باندھ کر دیا جاتا ہے یا پانچ کپڑوں کا جوڑا اور ایک روپیہ دیا جاتا ہے۔

حضرت بی بی کے کونڈے کی ابتدا شاہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں ہوئی تھی بیان یہ کیا جاتا ہے کہ جب شیر افگن کی بیوی سے بادشاہ کو بہت زیادہ محبت بڑھ گئی اور یہ یقین کیا جانے لگا کہ وہ آئندہ بادشاہ کی ملکہ ہونیوالی ہے تو بادشاہ کی جائز ملکہ اولے نے اپنی رقیب کی تذلیل کے لئے ایک عام جلسہ کیا جس میں خواتین دربار کو دعوت دی گئی مگر ملکہ خود شریک نہیں ہوسکی اُس وقت یہ شرائط طے پائے تھے کہ مہمان پاک و صاف ہوں اور انہوں نے سوائے اپنے شوہروں کے کسی اور مرد پر نظر نہ ڈالی ہو مزید حیلے کچھ بھی کئے ہوں مگر مہرالنساء ایسی دعوت میں شریک نہیں ہوسکتی تھی ملکۂ اولے کی ناراضی کے علاوہ اُسے یہ بھی جواب دہی کرنی پڑی کہ اُس نے حضرت بی بی کے دعوت نامے کی توہین کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ایسی کوئی عورت جس میں مذکورہ بالا صفات نہ ہوں اور دعوت میں شریک ہوجائے تو وہ بیماریوں میں مبتلا ہوجاتی ہے یا حضرت بی بی کا اُس پر کوئی غضب نازل ہوجاتا ہے نواب رامپور کی ایک بیگم کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی دعوت میں جو اُس نے خود ہی منعقد کی تھی بیٹھ گئی حالانکہ وہ اپنے عیوب سے واقف تھی چنانچہ کچھ مدت نہ گزری تھی کہ اُس کے منہ پر زہریلا دانہ نکلا جو کسی طرح اچھا نہیں ہوا اور اسکے رخسار میں سوراخ ہوگیا کہ وہ بالآخر اسی مرض میں جاں بحق ہوئی جو عورتیں اپنے آپ کو خود ہی ممنوع سمجھتی ہیں وہ اس دعوت میں شریک ہونے سے احتراز کرتی ہیں۔

اسی نوعیت کی خیرات پیغمبر صاحب کا کونڈا ہوتا ہے* ایک اور کونڈا ریوڑیوں کا مشکل کشا حضرت علی کا ہوتا ہے ریوڑیاں سوا پانچ یا ساڑھے پانچ پیسوں یا اسی تعداد کے آنوں کی ہوتی ہیں ان سب میں مرد شریک ہوسکتے ہیں۔ لیکن آخرالذکر کونڈا بی بی کے کونڈے کی طرح صرف صوفیوں یا پاک صاف شوہروں کے لئے مخصوص ہوتا ہے حالانکہ ایک اور رسم خیرات اللہ کی نیاز ہوا کرتی ہے جسے ہر شخص کھا سکتا ہے۔

(۴۰)

مس لوئیٹر کا بیان۔ غریبوں کو یاد رکھو

برج دیس کے مواتی۔ قصائیوں اور تولوں میں ایک

دستور مذکورہ بالا بی بی کے کونڈے کی طرح رائج ہے جسے کنڈوری کہتے ہیں۔

یہ سب تو ہیں مسلمان اور بالعموم خوشحال ہیں مویشی کھاتے پیتے کاشتکار۔ تولے تلائی کا کام کرنے والے اور قصاب یا قصائی مولیشیوں یا بھیڑوں کی تھوک یا خوردہ فروشی کرنے والے ہوتے ہیں۔ بچے خرید کر قصائی اہیروں یا گڈریوں کے حوالہ کر دیتے ہیں جب بچے بڑے ہوجاتے ہیں تو وہ انہیں دور و دراز مقامات حتیٰ کہ کلکتہ اور رنگون تک لے جاتے ہیں اور تھوک میں بیچ کر خوب منافع کماتے ہیں۔ تولے "بلم بھا" یعنی نمک سازی کے موسم میں نمک گڑھوں یا سائے سے نکالے جانے کے قبل تولائی کا کام کرتے ہیں۔

اناج سے لدی ہوئی گاڑیاں بازار میں لائی جاتی ہیں اور یہ کام تولوں کا ہوتا ہے کہ تھوک فروشی کے وقت اُسے تول دیں اس تولائی کی اُجرت وہ کم و بیش ایک آنہ فی من کے حساب سے لیتے ہیں یہ تولے بعض اوقات اپنی اُجرت معمول سے زیادہ بڑھا دیتے ہیں اور گاڑی لانے والا یا تو دو ایک دن اپنا مال روکے رہے ورنہ وہ اُن کے شرائط منظور ہی کر لیتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ زیادہ تول دینے کے صلہ میں خریدار انہیں رشوت دیتا ہے اور اس طرح تولا معمولی اجرت کے علاوہ کچھ اور روپیہ بھی پیدا کر لیتا ہے۔

بہرحال یہ لوگ خوب خوشحال ہیں لیکن اپنی فلاح کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فریضۂ مذہبی کی ادائیگی یعنی خیرات (آمدنی کا دسواں حصہ) کو نہیں بھولتے یہ خیرات وہ کل نعمتوں کے دینے والے کے نام پر اپنے منافع میں سے دیا کرتے ہیں اسی لئے اُن میں یہ مستقل رواج قائم ہوگیا ہے کہ وہ کارِ خیر میں صرف کرنے کے لئے آمدنی کا ایک جزو علیحدہ رکھ دیتے ہیں۔

یہ رقم اس طرح جمع کی جاتی ہے کہ زمین میں ایک گڑھا کھودا جاتا ہے جس میں پہیے کی دُھری لگا دی جاتی ہے اور گڑھے کے نیچے ایک ہانڈی یا مٹی کا برتن رکھ دیا جاتا ہے جو روپیہ پیسہ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ سوراخ سے ہوکر ہانڈی میں پہنچ کر محفوظ ہوجاتا ہے کیونکہ سوراخ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ اس میں سے روپیہ پیسہ صرف گزر جائے اس رقم کا کوئی چور بھی نہیں چھوتا کیونکہ وہ متبرک سمجھی جاتی ہے اسی طرح رقم بڑھتی رہتی ہے اور سوراخ کا منہ کسی برتن سے ڈھکا رہتا ہے جب مدار شاہ یا کسی دوسرے مزار پر عرس میں جانے کا وقت آتا ہے تو کوان تیار کیا جاتا ہے جسے کسی کمبل یا کھاروئے کے تھیلے میں رکھ لیتے ہیں اور دوران سفر یہ شیرینی راستہ بھر کھاتے چلے جاتے ہیں کیونکہ جب تک شام کو پڑاؤ پر نہ پہونچیں وہ راستہ میں کوئی اور چیز نہیں کھاتے منت پوری کرنے کے بعد واپس آکر کنڈوری کھولی جاتی ہے اور برآمد شدہ رقم سے برادری والوں کی دعوت کر دی جاتی ہے۔

(۴۱)

مرد کی آرزو اور عورت کی وفا

سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے لیکن زینت بستر پر جاگ رہی تھی پانچ پانچ منٹ بعد وحشت زدہ ہوکر وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور سر پکڑ لیتی تھی

پھڑکتی ہوئی کنپٹیوں کو ہاتھوں سے دبا تی تھی وہ وحشت سے چور تھی۔
اس کے اعضا میں بے چینی تھی ایک دفعہ اس کے بھائی نے پوچھا تم
اتنی پریشان کیوں ہو؟ ہولسیا نے زینت کا سر دبانا اور ہاتھ
پیر سہلانے شروع کر دیئے کہ نیند آجائے لیکن زینت نے
ہولسیا کو منع کر دیا اور کہا:۔

"مجھے گرمی لگ رہی ہے اب میں سو جاؤں گی"

ایک مرتبہ فطرت کا غلبہ ہوا اس سے تیز سانسیں لیتے سنا گیا یا
وہ گہری نیند میں تھی لیکن یہ ایک خواب پریشان تھا کیونکہ
جیسے ہی دو بجے زینت یکایک اٹھ بیٹھی اپنے بستر پر
کوئی چیز ڈھونڈنے لگی یہ اس کی دولائی تھی اس نے دولائی
سر سے اوڑھ لی کہ اسے کچھ سردی محسوس ہو رہی تھی آسمان
سیاہ ابر آلود تھا ایک تارہ بھی نظر نہیں آتا تھا ایک ہفتہ
قبل زور کی بارش ہو چکی تھی چونکہ نئے چاند کا زمانہ تھا
آثارات سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت تیز بارش ہونے
والی ہے۔

بائیس جون دوشنبہ کا دن تھا وہ کئی دن سے
اس دوشنبہ کی منتظر تھی اسے معلوم تھا کہ یہ دن اس کی
زندگی میں یادگار رہے گا۔ زینت کم عمر تھی اس نے
صرف پندرہ موسم سرما دیکھے تھے بالغ ہوتے ہی حضرت
عشق نے اس کی پیشانی پر مہر لگا دی اس کے رخساروں
کی سرخی غائب ہو گئی تھی وہ پہلے کی طرح شوخ و طرار
لڑکی نہیں رہی تھی زینت کے والد نے اس کے چہرے
اور طرز سے یہ تبدیلی معلوم کر لی تھی لیکن وہ خود اپنے
خیالات میں مستغرق تھے انہیں سیاسی قوت کا شوق
تھا اسی وجہ سے انہیں کم پرواہ ہوتی تھی کہ گھر میں کیا
ہو رہا ہے ان کا خیال تھا کہ ہماری زندگیاں مستلزم تقدیر
ہوا کرتی ہیں اگر ہم چاہیں بھی تو اپنی قسمت نہیں بدل
سکتے ہم چاہے جتنا زمین پر پیر ماریں یا منت و سماجت
میں ماتھا رگڑیں سب فضول و بے کار کیونکہ نوشتۂ
تقدیر ہو کر رہتا ہے مزید براں زینت کے والد
کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ذاتی منصوبہ بندیوں سے
توجہ ہٹا کر زنانہ زندگی کے الجھاؤ میں پڑتے۔

بہر صورت دنیا دار کی حیثیت سے زینت کے
والد کو یہ معلوم کرنے کی کانی سمجھ تھی کہ زینت اور
اس کے چچا زاد بھائی فرحت میں تعلق پیدا ہو گیا
تھا اور دونوں کے سینوں سے تیر عشق پار ہو گیا تھا
دنیا کی کوئی طاقت نہ یہ تیر نکال سکتی تھی نہ زخم اچھا
کر سکتی تھی یہ زخم یا تو خود بخود اچھا ہو یا ناسور بن کر اس
وقت تک قائم رہے جب تک عشاق کی تقدیریں نہ
پھریں۔ زینت کے والد نے کھنوت کے کنارے ایک
نجومی سے تخلیہ میں مشورہ کیا تھا جس کے کہنے پر
انہیں اعتقاد تھا اس نجومی نے یقین دلایا تھا کہ زینت
کے والد کے سر پر ہما کا سایہ پڑ چکا ہے نیز دونوں یعنی
ان کی لڑکی اور اس کا چچا زاد بھائی مریخ اور زہرہ کے
اتصال پر پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے ان کے مزاجوں
میں سودائے عشق تھا زینت کے والد بھی اپنے زمانہ
میں خود عاشق مزاج تھے لیکن ان کی پیدائش کے
وقت آفتاب دور تھا اس لئے ان کی بے اعتدالیاں
کسی کو معلوم نہیں ہوئیں ان کی بیٹی کا معاملہ بھی اسی
طرح تھا لیکن وہ اپنے ذاتی عز و وقار کی خاطر مصلحت

اور احتیاط سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے ذاتی طور پر انہیں
فرحت کے متعلق کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس لڑکے کو پسند
کرتے تھے جو انہیں اس وقت تک عزیز رہا جب تک اس
کے والد سے ان کا جھاڑیوں میں کھلا جھگڑا نہیں ہوا تھا
پھر مخدوم پور کی جائداد کا معاملہ تھا بنائے مخاصمت ہنوز موجود
تھی جس میں نوابی کی دوڑ میں انہیں اپنے رقیب سے ناقابل
برداشت شکست پانے کا اضافہ ہوگیا تھا وہ آئندہ بھی
قادر علی خاں کے دوست نہیں ہوسکتے تھے ان کے بیٹے
سے رشتہ قائم کرنا اب ناممکن تھا۔

زمانہ قادر علی خاں کے کافی خلاف ہو چکا تھا ان
کی نظامت میں بدامنی تھی شہر میں متواتر شورش رہتی
تھی نمایاں مظالم سے نواب چشم پوشی کر رہے تھے بلکہ
وہ ظالموں کے رفیق رہتے تھے چنانچہ زینت کے والد
کے لئے اچھا موقع تھا کہ وہ دعویٰ نظامت پیش کردیں
وہ ایسا موقع ہات سے جانے دینے والے بھی نہیں تھے
متضاد حقوق و امور کے پیش نظر وہ اودھ کی پسپائی سے
واپس ہوکر یکایک شاہجہانپور میں نمودار ہوئے ان
کے معتقدین جو با اختیار اور با اثر تھے ان کے گرد جمع
ہوگئے ایک جلسہ میں یہ قرار پایا کہ وہ سب بریلی پہنچکر
نواب خان بہادر خاں سے سند نظامت حاصل کرلیں۔

اس بات کو وہ اپنے آبائی مکان میں سوچ رہے
تھے برابر بریلی جانے کا عزم کر رہے تھے بستر پر لیٹنے
سے قبل انہوں نے اپنی بیٹی کو بلاکر پیار کیا جو ایک غیر معمولی
بات تھی وہ اپنی بچی کو کوئی تنبیہ کرنا ناپسند کرتے تھے
جب زینت واپس جانے لگی تو یہ کہا:۔

"چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

زینت نے دل میں کہا یہ تو بہت وسیع الفاظ ہیں ابا میاں
نے مجھ سے کہے ہیں تعجب ہے اگر میرے والد کو معاملہ کا
علم ہوگیا پھر تو کوئی مستقبل نہیں رہے گا فرحت کو ابا میاں
کے خیالات کا ضرور کچھ علم ہوا ہوگا ورنہ وہ آج ہی کا
دن اس کام کے لئے کیوں مقرر کرتے جس کے نتائج تباہ کن
ہوتے زینت پھر بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن میں نے
صادق القول ہونے کا وعدہ کیا ہے اپنے سر کی قسم
وعدہ پر قائم رہونگی حضرت بی بی میری مدد اور رہنمائی
فرمائیں پیر کا دن پورب کے سفر کے لئے اچھا نہیں ہوتا
بزرگوں نے یہی کہا ہے لیکن میں کیوں ڈروں کیونکہ جہاں
کہیں قسمت لے جائے گیا وہ میرا شریک حال نہیں
ہوگا؟ زینب! بزدلی نہ کر! میں غیر معمولی خطرات سے
ڈر کر عہد شکنی نہیں کروں گی اللہ ہماری خبرگیری کریگا۔

اسی طرح وہ دل ہی دل میں بحث اور ارادے
کرتی رہی اسی محویت میں وہ پھر لیٹی اور سوگئی اور جیسا
اوپر ذکر کیا گیا وہ یکایک اٹھ بیٹھی چہرے پر دولائی ڈالکر
پھر خیالات میں ڈوب گئی :۔

"اے میرے دلدار! میرا یہ ولولہ مجھے
کہاں لے جائے گا کتنے گہرے اور
تاریک کنوئیں جھانکنا اور ان کی لامحدود
گہرائی تلاش کرنا پڑے گی۔؟ معاذاللہ!
معاذاللہ!! کیا میری آنکھوں نے واقعی
فریب دیا یا محض خواب تھا؟ میں نے
دیکھا جس کی یقیناً کوئی اصلیت نہیں ہوسکتی

کہ میں گھر سے بہت دور فرحت کا پیچھا کرتی دریاؤں اور پہاڑوں سے گزر رہی ہوں اور فرحت مجھے چھو نہیں ملتا کہ میں بگولے میں گرفتار ہوکر فضا میں اُٹھالی گئی۔ میں اب پیر پٹک رہی ہوں نیچے دیکھ رہی ہوں۔ الامان والحذر! میں شعلوں میں گھر گئی لیکن جلی نہیں۔ میں روتی ہوں۔ بلکتی ہوں دل آہوں کے ساتھ نکلا جاتا ہے! میں فرحت فرحت! چلاتی ہوں۔ فرحت میری روح کی مسرت۔ میری جان آرزو تو کہاں ہے! کیوں نہیں آتا؟ مجھے اس جنات النار سے کیوں نہیں چھڑاتا؟ یہ تو جنت آتش ہے! دیکھ! مجھے کوئی اور گھور رہا ہے۔ وہ ہنستا ہے اور مجھے بھی ہنسنے اور اپنی گود میں آنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ کیا میں جو بہشت بریں میں اپنے لاثانی فرحت کی دُلہن بنائی گئی اور اس کی محبت میں اپنا سب کچھ بیچ دیا کیا میں اس کی امانت کسی اور کو دے سکتی ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تجھ پر تھو! ہٹ جا بدکار! دور ہو ظالم۔ آگ نہایت تیزی سے مشتعل ہوتی ہے جو سورج کی روشنی کو اپنی تیز شعاعوں سے ماند کر دیتی ہے۔ تمام سرزمین اطراف جھلس جاتی ہے پھر بھی میں نہیں جلتی۔ میری آہیں میرے گرفتار کنندہ کے رتھ کے پہیّوں سے جو آسمان کی طرف اُڑا جا رہا ہے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی ہیں۔ چاروں سمت سے آئی ہوئی آندھیاں ہمیں ایک کھجور کے درخت کے پاس لاتی ہیں جہاں..."

.... یکایک زینت کی آنکھ کھل گئی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

(۴۲)

اسیرِ بلا

کوئی شک و شبہ نہیں کہ زینت کا دماغ چل گیا تھا تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس سے کیا اُمید کی گئی تھی اُس نے بجلی کی چمک میں دیکھا کہ سب سو رہے تھے اسکی ماں اور چچی اور باہر والد اور برادران سب خوابِ شیریں میں مبتلا تھے وفادار ہوسیا اس کی رفیق و رازدار دالان میں پڑی خراٹے لے رہی تھی گھنٹے نے تین بجائے۔ اب توقف نامناسب تھا وہ ساعت آن پہنچی جس کے لیے اُس نے خواہ اچھا یا بُرا فیصلہ کر لیا تھا ہلکی رضائی چاروں طرف سے لپیٹ کر وہ بستر سے اُٹھی نہایت آہستہ اور سکوت سے باغ میں ہوتی ہوئی پیچھے کے دروازہ سے نکل گئی اس کا قدم استوار تھا حالانکہ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا وہ اپنے پیارے گھر پر ایک نظر ڈالنے کو بھی نہیں ٹھہری نہ ہی اُن عزیزوں کو جن سے گھر کی رونق تھی اور جو بے خبر لیٹے پڑے تھے۔ دیکھئے ذرا بھی ٹھٹکی دل کے ولولے اور گرم جوشی نے اس کی عقل کو چکا چوند کر دیا تھا وہ آگے قدم بڑھانے پر مجبور ہو چکی تھی پردہ نشین شریف زادی

ناز و نعمت کی پلی نازنین جس کی تمام دُنیا زنان خانہ کی چار دیواری کے اندر محدود تھی آج بے حجابانہ فطرت کا عریاں چہرہ دیکھنے کے لئے باہر آگئی تھی آج کی رات کالی۔ سیاہ۔ اور ڈراؤنی تھی آسمان پر بادل گرج رہے تھے فضا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بجلی کوند جاتی تھی باغ سے باہر آکر بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا کہ گلی میں ایک میانا اُس کے انتظار میں رکھا تھا۔ کہار مُنہ ڈھانپے پہلے ہی سے تیار تھے اور ایک لانبے قد کا مرد مُنہ چھپائے قریب ہی اُس کی آمد کے انتظار میں ٹہل رہا تھا بغیر کچھ کہے سُنے زینت "میانے" میں بیٹھ گئی کہاروں نے میانا کاندھوں پر اُٹھا لیا اور ہوشیاری لیکن تیز قدمی سے دکھن کی طرف روانہ ہوگئے پہلے بہادر گنج آیا پھر بجلی پدہ اور بیہدرہ (بہادر) پور نکلے۔ گلاب باڑی کے مدرسہ کے قریب سے کہار اُلٹی طرف مُڑ گئے اور کھنتوت کے سیدھے ساحل پر خربوزوں کی فصل میں چل نکلے کئی دن پہلے سے دریا چڑھ رہا تھا مگر سُست رفتاری سے بعض مقامات پر ہنوز پایاب تھا کہار بلا پس و پیش دریا میں داخل ہوگئے اور اپنے ڈنڈوں سے راستہ معلوم کرتے آگے بڑھنے لگے صرف دوسو گز کا فاصلہ تھا اس لئے وہ دوسرے ساحل پر جلد پہونچ گئے کہار پوری رفتار سے چل کر تھک گئے تھے تیز قدمی کی وجہ سے اُن کے دَم بھی ٹوٹ گئے تھے انہوں نے ایک جگہ ریت پر "میانا" رکھ دیا اور اس سے کچھ ہٹ کر دَم لینے لگے۔

آدھا گھنٹہ ہوا تھا کہ وہ لانبا مرد جسے اب ہم نیرز کے نام سے موسوم کرتے رہیں گے موقع پر پہونچ گیا اُسے تیز رفتار کہاروں کے ساتھ چلنا ناممکن تھا کہاروں کی چلم کے دو ایک گھونٹ پی کر اس نے اُن سے اُٹھنے کو کہا کہ مشرق سے نمودِ صبح کے آثار ہویدا ہو رہے تھے اُس نے کہا:۔

"جلدی کرو! اگر تم دن نکلنے سے پہلے ہی
سرحد پار کرلوگے تو تمہارا انعام واجب
ہوجائے گا۔ ہاں جلدی کرو"

کہار کچھ سستا چکے تھے لہذا سب کھڑے ہوگئے کاندھوں پر ڈنڈے رکھ کر میانے کو زمین سے اُٹھا لیا اُن میں سے ایک پکارا:۔

"بھلے بھائی! میانا تو پہلے سے ہلکا ہے
جے کا بات ہے؟"

دوسرے نے کہا:۔

"جے تو عجب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے
اس میں کوئی بیٹھا ہی نہیں ہے"

تیسرے نے کہا:۔

"کے بھیّا! باپ کی سوگند جا میں کوئی
بھید ہے"

چوتھے نے کہا:۔

"میانا رکھدو۔ جے تو پھول سا ہلکا ہے"

چنانچہ کہاروں نے میانا رکھدیا دوسرے نے پھر آزمایا اور کہا:۔ "سچ سچ اس میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا یہ تو
بالکل ہلکا ہے جب ہم سستا رہے تھے
تو شاید بی بی صاحبہ میانے سے نکلی ہونگی
میاں نے چلنے کی جلدی کی اس وجہ سے
بی بی صاحب پیچھے رہ گئیں" سب نے بالاتفاق
کہا:۔ "ہاں ہاں یہی وجہ میانے کے ہلکا ہونیکی

ہوسکتی ہے کیا ہم اندر جھانک کر دیکھ لیں
تاکہ اطمینان ہوجائے۔"

اس اثنا میں فیروز آگیا وہ وضو کرکے فجر کی نماز پڑھنے پیچھے رہ گیا تھا میانے کو ابھی تک زمین پر رکھا اور کہاروں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر فیروز نے غضبناک ہوکر کہا:۔

"نالائقو! کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا
کہ فوراً میانا لے کر بڑھ چلو۔ تم نے میانا کیوں
رکھدیا اور فضول باتوں میں کیوں وقت
گنوا رہے ہو؟"

کہاروں کے چودھری نے کہا:۔

"میاں! ہم تو اچھے خاصے مصیبت میں
پڑگئے آپ کا حکم پاتے ہی ہم چلدیئے
لیکن اب آگے کیا جائیں میانے میں تو
کوئی معلوم ہی نہیں ہوتا ہم سب میانہ
دیکھ رہے تھے۔"

"ارے مردود! بے وقوف تو کیا بکتا ہے
کافر! کیا تو پردے کے اندر جھانکنا چاہتا
تھا"

"نہیں میاں! آپ کا غلام کہیں ایسا
کرسکتا ہے آپ آکر ذرا خود ہی میانا
اٹھائیے اب بتائیے اس کے اندر کوئی بھی
معلوم ہوتا ہے؟"

فیروز حیرت میں تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ میانا فی الحقیقت ہلکا تھا۔ پر کی طرح ہلکا۔ اس کی سواری کیا ہوئی؟ یہ تو تہذیب کے خلاف ہوگا کہ میں اس کے اندر جھانک کر دیکھوں میں پردے کی حرمت کیسے توڑ سکتا ہوں میرا دوست اس فعل کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ تو عجیب مخمصہ ہے اپنے دوست کی خاطر مجھے قانون شکنی کرکے اندر دیکھنا بھی لازمی ہے کیونکہ اگر زینت خواہ زندہ یا مردہ موجود نہیں ہے تو خالی میانے کا اسرار غیر فطری اسباب ہونگے چنانچہ فیروز نے پردہ اٹھاکر اوپر پھینک دیا اس نے منہ اندر ڈال کر جائزہ لیا لیکن میانے میں کوئی نہیں تھا زینت کا کوئی پتہ کوئی نشان نہیں ملا یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کبھی کوئی بیٹھا بھی تھا اس نے پردہ چھوڑ کر کہار پر قہر آلود نظر کی اس راز کا پتہ چلنا چاہیئے فیروز نے دانت پیس کر کہا:۔

"میں تمہارا سب کا سر توڑ دوں گا"

یہ کہہ کر اس نے تلوار کی موٹھ پکڑلی۔

وہی کہار پھر بولا:۔

"میاں! ہم تو آپ کے آدھین ہیں آپ
چاہے مار ڈالیں مگر ہمیں یہ بھید معلوم
نہیں ہم خود اچنبھے میں پڑے ہیں حضور
سچ جانیئے کہ میانے کو ہلکا پاکر ہم سب
ہکا بکا ہوگئے ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے
کہ آپ کے سامنے جب ہم سب ندی
کے اس طرف دم لے رہے تھے شاید
بی بی صاحب کسی ضرورت سے باہر
نکلی ہوں اور قبل ازیں کہ واپس آکر سوار
ہوں ہم آپ کا حکم پاکر میانا لے کر
چل دیئے۔"

فیروز نے دل میں کہا یہی ہوا ہوگا یا میانے سے گر کر زینب ڈوب گئی! اور کیا ہوسکتا ہے؟ اب میں فرحت کو کیا جواب دوں گا جس نے اپنا سب سے قیمتی ہیرا میرے سپرد کیا تھا کیا فرحت کبھی بھی یقین کرے گا کہ ندی عبور کرتے وقت زینت ڈوب گئی؟ کیا وہ میری نیت پر شک نہیں کرے گا؟ کیا مجھ پر بدترین الزام نہیں لگائے گا؟ اور لوگ بھی یہی کہیں گے۔ جملہ قرائن میرے خلاف نظر آتے ہیں وائے قسمت! مجھ پر ایسے وقت عذاب نازل ہوا جب ہم اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہوگئے تھے۔

سر کھجا کر وہ یہی خیالی پلاؤ پکا رہا تھا اس نے اپنا صافہ زمین پر ڈال دیا تھا اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی ذرا دیر بعد اس نے پھر خیال کیا کہ اس رنج کرنے سے فائدہ؟ اگر فی الحقیقت وہ پیچھے رہ گئی ہے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ مل جائے گی۔ اگر ندی میں گر گئی ہے تو خواہ کتنا ہی سیلاب ہو میں دریا میں تلاش کراؤں گا لاش نکلواؤں گا اور فرحت کے روبرو اپنی بے گناہی کا بے زبانی اور ناقابلِ انکار ثبوت پیش کر کے اپنے چاقو مار کر اسی طرح مر جاؤں گا۔ فیروز نے کمر سے چاقو نکال لیا تھا اور آخری حصۂ تقریر کی تکمیل کر ہی دی تھی وہ چاقو مارا ہی چاہتا تھا کہ ایک اجنبی شخص نے اس کا طاقت ور ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:-

"ہوش میں آؤ! فضول رنج محن میں وقت
ضائع نہ کرو اس کے بجائے اس مقام پر
میرے ساتھ واپس چلو جہاں تم نے ندی
پار کی تھی اور کل ساحل پر مکمل تلاش کرو۔"

چنانچہ دونوں اس کام پر روانہ ہو گئے کہار میانے کے پاس رہے دن نکل آیا تھا ابر میں چھپا ہوا سورج افق سے جھانک رہا تھا کہ ایک جوان منہ چھپائے گھوڑے پر سوار میانے کے پاس آیا کہاروں سے پوچھا "میانا کس کا ہے؟ اور تم صبح سویرے یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایک اور آدمی تم سے بہتر لباس میں اور تم سے لانبا بھی تھا؟"

کہار پریشان ہوگئے بظاہر وہ کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتے تھے اس کے برعکس سوار اُن کے پژمردہ چہرے دیکھ کر نمایاں تشویش میں مبتلا تھا اُن کے جواب کا انتظار نہ کر کے وہ فوراً گھوڑے سے اُتر کر لڑکھڑاتا ہوا میانے کے پاس آیا پردہ ایک طرف کو الٹ دیا اور اندر دیکھا حیرت حسرت اور خوف نے اس پر غلبہ پالیا حیران ہو کر اس نے کہاروں سے پوچھا:-

"بی بی صاحب کہاں گئیں؟ اور وہ لانبا
آدمی کدھر ہے؟ خدا کے واسطے جواب
دو۔ جلد جواب دو!"

کہاروں کو اپنے کام کی حقیقت سے کافی آگاہی تھی انہوں نے دو لفظوں میں کل حادثہ بیان کر دیا کہ دریا عبور کرنے تک سب کام درست رہا پھر یکایک بی بی صاحب میانے سے غائب ہوگئیں، کہاروں نے یہ بھی بتایا کہ لانبے قد والے بی بی صاحب کو تلاش کرنے گئے ہیں۔

دغاباز! جھوٹا دوست! چھپا سانپ! کیا میں اسی دن کے لئے اپنے دل کی سب سے زیادہ عزیز امانت تیرے سپرد کی تھی؟ ظالم! تو نے مہلک زخم

لگایا ہے۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں؟ تجھے کہاں پاؤں کہ تیرے پُر فریب سینہ میں تلوار بھونک دوں ایسے سینہ میں جو دوست کی طرف سے تیرے دل میں آتی کپٹ رکھتا تھا۔ زینب! میں جانتا ہوں تو زبردستی لے جائی گئی ہے مگر تیرے لئے دل کا چین میری آبرو میری زندگی سب تمام ہوگئی۔ آج سے اپنے والدین کے گھر سے نکالا ہوا خانماں برباد پھرتا پھروں گا۔ وطن سے دور۔

۔احباب سے دور۔ ذلت کے ساتھ لوگ مجھ پر انگشت نمائی کرینگے۔ ہاں! میں اسی لائق ہوں میں نے تجھے تیرے پیارے گھر سے چھڑایا تجھے تیرے ماں باپ اور رفیق بھائیوں سے جدا کرایا کہ تو میرے ساتھ نکل چلے ہائے تقدیر میں یہ تھا کہ ایسا شخص جسے میں دوست کے پاک نام سے منسوب کرتا تھا تجھے بہ جبرو زبردستی ہم آغوش کرے۔ میں بدنصیب! آوارہ! قہرِ خدا میں آگیا! اے گنبدِ نیلی فام پھٹ پڑ۔ مجھ پر پھٹ پڑ۔ طعنہ زن دُنیا سے مجھے چھپالے۔ زینت کے والدین کی محزون نظریں اور بھائیوں کے انتقام سے بچالے ہاں! میں اس مقام سے دور بہت دور بھاگ جاؤنگا

کسی گمنام سرزمین میں بے نام و نشان ہوکر تاریکی میں دفن ہو جاؤں گا۔

رنج والم کو اس طرح ظاہر کرتے ہوئے نوجوان فرحت زمین پر گر پڑا اور غافل ہوگیا۔ یہ سانحہ اس کی برداشت سے باہر تھا اُسے غش آگیا تھوڑی دیر میں اس نے متوحش آنکھیں کھول دیں جوشِ غضب سے اپنے بال نوچنے لگا۔ سر پکڑ کر زمین سے اُٹھا اور چلایا کہ

میرا سر! زینت! میرا سر! میں تجھے
کہاں دیکھ رہا ہوں تو ہات پھیلائے مجھے
التجا کر رہی ہے کہ میں تجھے تیری زبردستی
کی قید سے نجات دلانے میں مدد کروں۔
تیری مصیبت! تیری آواز میں سن رہا ہوں
رومت۔ میں آیا۔ پیاری میں آیا!"

یہ کہکر وہ دوڑ پڑا اس طرح گویا وہ کسی خاص شے کی طرف جارہا ہو۔ میان سے تلوار کھینچے وہ کسی خیالی شے پر ہوا میں چلا رہا تھا اور لگا تار چیختا تھا:۔

"آیا میں آیا" فرحت مجنون ہوگیا!

(باقی)

مکاشفاتِ کشفی

(بسلسلہ صفحہ ۴۰)

ہمارے کشفی صاحب بھی اس دوسری جماعت کے انسان ہیں اور اس لئے وہ سرگرداں رہتے ہیں کہ اپنے جذباتی تصورات اور تخیلی محسوسات کو رباعیات کی وساطت سے حکیمانہ نظریات اور فلسفیانہ کلیات کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس بنا پر رباعیاتِ کشفی کی معنوی حیثیت کا جہاں تک تعلق ہے میں ان سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک ان کے طرزِ بیان۔ طرزِ ادا اور استخوان بندی کا تعلق ہے میں اپنے کو ان کے مداحوں میں شمار کرتا ہوں۔

اس موقع پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اظہار نہایت ضروری ہے کہ دُنیائے شاعری میں "کیونکر کہاہے" کو

(۱) مولانا محمد مظہر نانوتوی رح

(۲) مولانا محمد منیر نانوتوی رح

(۳) مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی

از
محمد ایوب قادری بی۔ اے

(۱) مولانا محمد مظہر نانوتوی رح مولانا محمد احسن نانوتوی رح کے حقیقی بڑے بھائی تھے ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وحفظ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا پھر مولانا مملوک العلی نانوتوی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی علم حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رح سے حاصل کیا مولانا محمد مظہر تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہوگئے وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصّہ لیا۔ جس کا ذکر مولانا محمد احسن نانوتوی کے سلسلہ میں ہوچکا ہے مولانا محمد مظہر کے پیر میں گولی لگی تھی جہادِ شاملی کے بعد تمام سرکار مصائب وآلام میں مبتلا رہے مولانا محمد مظہر نانوتوی پھر روپوش ہوگئے اس زمانہ میں کچھ دنوں بریلی بھی رہے جب معافی عام ہوئی تو ظاہر ہوئے ملازمت سرکاری سے قطع تعلق ہوگیا گھر پر طلبا کو درس دینا شروع کردیا مولانا کی شرکتِ جہاد کا حال، اخفا و پوشیدگی کی نظر ہوگیا۔

رجب ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں مولوی سعادت علی سہارنپوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمرالدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنا مکان مدرسہ کے لئے وقف کردیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی حافظ فضل حق صاحب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام مظہر العلوم تجویز ہوا مگر مولانا محمد مظہر نے اپنے نام کی نسبت کو پسند نہ فرمایا آخر بہت اصرار کے بعد مظاہر العلوم تجویز ہوا۔ یہ

مدرسہ ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ ہے۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے[۱] ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے ہمراہ مولانا محمد مظہر نے پہلا حج کیا۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں دوسرا حج کیا۔ مولانا محمد مظہر کے تعلقات مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بہت خصوصیت کے تھے[۲]

مولانا محمد مظہر حدیث و فقہ میں بڑا درک رکھتے تھے مولانا محمد احسن نانوتوی نے جب مولوی خرم علی بلہوری کے ورثا سے درمختار کا اردو ترجمہ اشاعت کی غرض سے خریدا تو اس کتاب کے بقیہ ترجمے اور صحت و درستی میں مولانا محمد مظہر نانوتوی پورے شریک رہے جیسا کہ مولانا محمد احسن نے کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے[۳] مولانا محمد مظہر نانوتوی نہایت متقی، پرہیزگار منکسر المزاج اور نیک نفس بزرگ تھے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں سہارنپور میں لاولد فوت ہوئے آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے ممتاز مثل مولانا خلیل احمد انبیٹھوی وغیرہ تھے۔

(۲) مولانا محمد منیر نانوتوی

مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی پھر دہلی پہونچکر مولانا مملوک العلی نانوتوی، مفتی صدرالدین آزردہ اور شاہ عبدالغنی مجدد دہلوی سے جملہ علوم کی تکمیل کی۔ مولانا محمد منیر صاحب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے۔ آپ جنگ شاملی میں دوسرے اکابرین کے ساتھ شریک رہے اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا محمد منیر حربی سکریٹری تھے اور خوب دادِ شجاعت دی جیسا کہ سوانح قاسمی سے اندازہ ہوتا ہے جنگ شاملی کے بعد مولانا محمد منیر بھی روپوش ہو گئے۔ معافی عام کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی کے پاس بریلی پہونچے ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے[۴] مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم تھے اور اس کا نظم و نسق زیادہ تر ان ہی سے متعلق رہا۔ بریلی ہی سے پنشن پائی ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔

مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ایمانداری اور دیانت داری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ارواح ثلاثہ میں تحریر ہے کہ

> "ایک مرتبہ مولانا محمد منیر نانوتوی دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روداد چھپوانے کے لیے ڈھائی سو روپے لے کر دہلی گئے اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے مولانا محمد منیر اس

---

[۱] مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو "فرنگیوں کا جال" از مولانا امداد صابری دہلوی

[۲] ملاحظہ ہو مذہب منصور از مولانا منصور علی خاں مرادآبادی و تذکرۃ الرشید حصہ دوم از مولوی عاشق الٰہی میرٹھی۔

[۳] ملاحظہ ہو حاشیۃ الاوطار مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی۔

ماعوثرکی کسی کو اطلاع کئے بغیر نانوتہ کے اپنی
زمین فروخت کرکے روپیہ فراہم کیا اور اس
سے روداد چھپواکر لائے کچھ عرصہ کے بعد
جب مجلس ارکان شوریٰ کو اس کا علم ہوا
تو انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے
اس کے متعلق فتویٰ دریافت کیا مولانا
گنگوہی کے پاس سے جواب آیا کہ مہتمم صاحب
امین تھے اور روپیہ چونکہ بلا تعدی کے
ضائع ہوا اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا
ارکان مجلس نے مولانا رشید احمد گنگوہی کا
فتویٰ دکھاکر مولانا محمد منیر سے درخواست
کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں مولانا محمد منیر
نے فرمایا کہ "فتوے کی بات نہیں ہے اگر
خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ
پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے چنانچہ
اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار
کردیا مولانا محمد احسن کے انتقال کے بعد
دارالعلوم کی مہتممی سے مستعفی ہوکر ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء
میں نانوتہ واپس آگئے خارج اوقات
میں دارالعلوم میں مولانا محمد منیر عربی ادب
کی کتابیں طلباء کو پڑھایا کرتے تھے"۔

مولانا محمد منیر کی صورت نہایت نورانی تھی۔ قد بڑا
چہرہ لمبا۔ داڑھی گھنی قدرے لمبی تھی بلا ضرورت بات چیت
نہیں کرتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے ہر موسم میں بڑے پائچوں
کا پاجامہ پہنتے تھے جب ہر مہینے پنشن لینے سہارنپور جاتے
تو اپنے اعزا کے گھروں پر جاکر دریافت کرتے کہ کچھ منگانا
تو نہیں ہے؟ ان کی فرمائشیں لکھ کرلے جاتے اور خریدکر
لاتے محلہ کے تمام لوگ مولانا محمد منیر کا نہایت احترام
کرتے تھے۔ مولانا نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے آخر زمانہ
میں مطبع مجتبائی دہلی سے بھی تعلق رہا۔

مولانا محمد منیر نے امام غزالی کی کتاب منہاج العابدین
کا اُردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا جو کہ مطبع صدیقی
بریلی سے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں طبع ہوا مولانا کی ایک دوسری
تصنیف فوائد غریبہ ہے جو کہ مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی
ہے یہ رسالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب توحید و
رسالت سے متعلق ہے۔ دوسرا باب نفس کے بیان میں
ہے۔ تیسرا باب قرآن شریف کی تلاوت کے متعلق ہے
کتاب نہایت مدلل ہے اس مختصر سے رسالہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ مولانا منقولات کے علاوہ معقولات میں
بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے افسوس کہ تاریخ انتقال معلوم
نہ ہوسکی ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء تک کی تحریر تو ہمارے پاس محفوظ ہے
۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں حج ادا کیا۔

مولانا محمد منیر کے ایک صاحبزادے حافظ محبوب الرحمٰن
اور ایک صاحبزادی ام فضل تھیں ام فضل مولانا
محمد احسن نانوتوی کے صاحبزادے مولوی حافظ فضل الرحمٰن
صاحب کو منسوب تھیں حافظ محبوب الرحمٰن صاحب کے
تین صاحبزادے حافظ مقبول الرحمٰن، حافظ مطلوب الرحمٰن
اور عطاء الرحمٰن ہوئے جن کا سلسلۂ اولاد پاکستان اور
بھارت میں موجود ہے۔

---

(۳) مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی

مولوی عبدالاحد بچپن ہی سے ذہین طباع اور ہوشیار تھے۔ مولانا محمد احسن نے مولوی عبدالاحد کی پرورش بہت اچھے طریقے پر کی مولوی عبدالاحد نے تمام تعلیم مولانا محمد احسن سے حاصل کی۔ مولانا محمد احسن مولوی عبدالاحد کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کپڑے اچھے سلوائے جاتے تھے روزانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ بیماری کی حالت میں نہایت غور سے علاج ہوتا تھا۔ رمضان شریف میں مولوی عبدالاحد کے ختم قرآن پر علٰحدہ شیرینی تقسیم ہوتی تھی مولوی عبدالاحد نے اول قرآن شریف حفظ کیا اس کے بعد مولانا محمد احسن سے درس نظامی کی تکمیل کی ۱۸۵۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس پاس کیا پھر بدایوں گورنمنٹ ہائی اسکول میں تھرڈ ماسٹر ہوگئے بدایوں میں کوچۂ عباسیان میں قیام رہا ۱۸۶۵ء میں الہ آباد سے وکالت کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اسی سال "رسالہ ہلال بنگال" انبالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں اس سلسلے کو منقطع کرکے میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔ پھر ۱۸۷۳ء میں منشی ممتاز علی ابن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی دہلی پانچ سو روپیہ میں خریدا۔ مولوی عبدالاحد نہایت نیک نفس، منکسر المزاج، ملنسار اور خلیق تھے[۱] نقشبندی سلسلے میں بیعت تھے حضرت مجدد صاحب کے حالات میں ایک کتاب "حالات و مقامات مجدد الف ثانی" مرتب کی جو ۱۳۲۹ھ میں مطبع مجتبائی میں چھپی ہے اعزا[۲] نانوتہ کی ہمیشہ مالی امداد کرتے تھے قومی کاموں میں بھی حصہ لیتے تھے[۳] دہلی کے عمائدین میں آپ کا شمار تھا علیگڑھ[۴] کالج کے ٹرسٹی تھے آنریری مجسٹریٹ رہے خان بہادر کا خطاب تھا حکام اور گورنمنٹ میں بڑا رسوخ تھا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں انتقال ہوا اس زمانہ میں تحریک خلافت زوروں پر تھی اور حکام رس حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے لہذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی میت کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مولوی عبدالاحد کا نام مطبع مجتبائی دہلی کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا مطبع مجتبائی برصغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں تھا اس مطبع سے عربی، فارسی اور اُردو کی ہزارہا کتابیں طبع و شائع ہوئیں مولوی عبدالاحد مطبع کا ہر کام خود دیکھتے تھے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی نظر رکھتے تھے[۵] ملازمین مطبع کا خاص خیال رکھتے تھے انکو ضرورت کی اشیاء فوراً فراہم کی جائیں مطبع مجتبائی میں ایک شخص مسمی کالے خاں کا تقرر ہوا۔ مولوی عبدالاحد نے اپنے صاحبزادے عبدالعزیز کو تحریری ہدایت کی کہ

"یہ شخص ضعیف العمر ہے اس سے وزنی چیز نہ اُٹھوائی جائے اور نہ دَوڑ دھوپ کا کام لیا جائے"[۶]

---

[۱] تاریخ دارالحکومت دہلی جلد دوم از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی [۲] میرے زمانہ کی دلی از ملا واحدی دہلوی [۳] حیات اجملی از قاضی عبدالغفار مرحوم [۴] یادگار دہلی از سید احمد ولی اللّٰہی۔ [۵] قلمی بیاض مولوی عبدالاحد دہلوی

مطبع میں نہایت فاضل و قابل حضرات تصحیح و تالیف وغیرہ کے لئے موجود تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ مولانا محمد احسن نگرامی۔ مولوی محمد منیر نانوتوی، مولوی فضل الرحمٰن (پسر مولانا محمد احسن نانوتوی) مولوی خلیل الرحمٰن برہانپوری مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد بیگ دہلوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی عبدالاحد کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بیوی سکینہ دیوبند کی تھیں ان سے سات لڑکے دو لڑکیاں ہوئیں لڑکوں کے نام عبداللطیف، عبدالعلیم، عبدالحمید، عبدالمجید عبدالحفیظ، عبدالمتین اور عبدالوحید ہیں اور لڑکیوں کے نام رابعہ اور امت العزیز ہیں عبداللطیف۔ عبدالعلیم اور عبدالحمید کا انتقال ہو چکا ہے باقی لڑکے کراچی میں ہیں حاجی عبدالمتین مکتبہ احدیہ (مشن روڈ کراچی) کے مالک ہیں۔ حاجی عبدالمتین کے دو صاحبزادے کمال متین اور مراد متین ہیں کمال متین طباعت کی اعلےٰ تعلیم کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں۔ حصولِ تعلیم کے بعد کمال متین کی زیر نگرانی مطبع مجتبائی کراچی میں قایم کیا جائے گا۔ مراد متین انجینرنگ کی اعلےٰ تعلیم کنیڈا کی مشہور یونیورسٹی میکگل میں حاصل کر رہے ہیں رابعہ کی شادی دیوبند ہوئی تھی اور امت العزیز کی شادی شمس العلما مولانا سید احمد بخاری امام جامع مسجد دہلی کے ساتھ ہوئی تھی جن کے دو صاحبزادے رشید بخاری اور عزیز بخاری ہوئے ان دونوں بھائیوں کی شادیاں محمد سلیمان چیف انجینیر کی صاحبزادیوں ناہید اور نورجہاں سے ہوئیں مولوی عبدالاحد کی دوسری شادی مقصودہ بنت مولانا شیخ محمد تھانوی سے ہوئی تھی ان سے دو لڑکے عبدالعزیز و عبدالرحیم اور پانچ لڑکیاں محمودہ، صغریٰ، امت الرحمٰن، حمیدہ خاتون اور رشیدہ خاتون ہوئیں محمودہ اور امت الرحمٰن کی شادیاں مولوی محمد محمود (ابن مولانا شیخ محمد تھانوی رح) کے صاحبزادوں محمد علی اور محمد افضل سے ہوئیں محمودہ کا انتقال ہو چکا ہے امت الرحمٰن بھارت میں موجود ہیں حمیدہ خاتون محمد سلیمان چیف انجینیر سے منسوب ہوئیں رشیدہ جو ڈاکٹر محمد الیاس کی اہلیہ تھیں فوت ہو چکی ہیں اور صغریٰ کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا۔

مولوی عبدالاحد کی بہن زینب کی شادی حکیم عبدالسمیع نانوتوی کے ساتھ ہوئی تھی جن سے دو لڑکیاں رقیہ اور صفیہ ہوئیں جو کہ حکیم معین الدین (ابن مولانا محمد یعقوب تھانوی) کے صاحبزادوں محمد عیسیٰ اور عبدالحی کو منسوب تھیں۔

لہ شمس العلما سید احمد (ابن حافظ سید محمد) امام جامع مسجد دہلی کے مورث اعلےٰ شاہ عبدالغفور عہد شاہجہانی میں وارد ہند ہوئے اور شاہی جامع مسجد دہلی کے امام و خطیب مقرر ہوئے اس وقت سے یہ خاندان معزز و مفتخر چلا آرہا ہے شمس العلما سید احمد دہلوی کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) یادگار دہلی از سید احمد ولی اللٰہی (۲) واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم از بشیرالدین احمد دہلوی

(۳) میرے زمانے کی دلی از ملا واحدی دہلوی

بعض روہیلکھنڈی محاورے

(جناب محبوب عالم عکس)

اس دور میں زبان کا افسانہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا جبکہ دوسری قومیں "یزداں بہ کمند" کا عزم کئے ہوئے ہیں لیکن قومی سرمایہ کی حفاظت بھی ایک اہم فرض ہے۔ اور غالباً اس احساس فرض ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج گوتم بدھ کے شہپارے ویدوں کے اشلوک۔ زبور و گیتا کے سرمدی نغمے۔ اوستا کے زرّیں اصول۔ توریت و انجیل کی ہدایات کسی نہ کسی شکل میں ہم تک پہونچیں۔ ورنہ قدرت کا تو یہ اصول اٹل ہے کہ زمین و آسمان کی گردش میں جو چیز بھی آگئی وہ منقلب ہوکر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ کل کی اور آج کی تہذیب میں بڑا فرق ہوگیا۔ دیکھئے کل کی بات ہے کہ جو لوگ دوسروں کی قدیم وضع وقطع پر ہنستے تھے۔ وہ خود آج لپنے انگرکھے۔ چوڑی دار پائجامہ۔ دوپلی ٹوپی اور گرگابی پر خنداں ہیں۔ اسی طرح کون جانے کہ آج کی تہذیب کی شکل کل کیا ہوجائے گی۔ کیونکہ یہ دنیا ایسی سرپٹ دوڑ رہی ہے کہ کل کی چیز۔ آج ماضی میں شمار ہورہی ہے اور اس لئے کہ ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

اس پر مستزاد یہ ہوا کہ برصغیر کی تقسیم نے اور بھی حالات بدل دئے۔ بعض علاقوں کے مخصوص محاورے اور الفاظ قابلِ لحاظ تھے آج حالات بدل گئے۔ پاکستان میں ہمیں اپنے اس ثقافتی اور تمدنی ورثہ کی حفاظت کرنی چاہیئے، یہاں ہمیں روہیلکھنڈ کے بعض مخصوص محاورات و الفاظ کا جائزہ لینا ہے کیونکہ یہ الفاظ جو روہیلکھنڈ میں بولے جاتے ہیں ممکن ہے کل حرفِ غلط کی طرح مِٹ جائیں۔ یوں تو اردو کا لب و لہجہ پورے روہیلکھنڈ کا یکساں ہے لیکن رامپور کو ہم امتیازی حیثیت دے سکتے ہیں کیونکہ یہ نوابان رامپور کی سرپرستی کی بدولت علماء و شعرا و ادبا کا مرکز رہا ہے۔

نوابان روہیل کھنڈ کے ذوقِ علم پروری نے سرزمین رامپور کو علم و ادب کا ایک ایسا سنگم بنادیا تھا جس کی حیثیت مُسلّم تھی دہلی و لکھنؤ کی تباہی کے بعد شاید ہی کوئی شاعر و ادیب و فن کار ایسا بچا ہو جس نے رامپور کا رُخ نہ کیا ہو۔

گو یارانِ طریقت نے رام پور کی زبان کو اُجڈ و اکھڑ کہہ کر اپنے دل نا مطمئن کو تسکین دینے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن اس حقیقت کا بہرحال اعتراف کرنا پڑا کہ دہلی و لکھنؤ کے بعد شمالی ہند میں اہلِ زبان کا مرکز رام پور رہا ہے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ عوام اور خواص کے طرز گفتگو میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے چنانچہ یہ بات دہلی و

لکھنؤ میں بھی موجود ہے کہ ہر شخص کی زبان اور روزمرہ قابل سند نہیں:-

رام پور کے وہ مستعمل الفاظ جو کچھ تو مٹ گئے اور آئندہ چل کران کی بھی بقا خطرے میں ہے۔ اسی اندیشہ کے تحت کچھ الفاظ تحریر کیے جاتے ہیں تاکہ محفوظ رہیں۔ اور ان کے آئینہ میں ہم اُردو ادب کے ارتقاء کا جائزہ لے سکیں۔

الفاظ **معنی**

آجی ۔ اکثر گھرانوں میں بچے اپنی والدہ کو کہتے ہیں۔

اداؐ ۔ والدہ کی طرح والد کو کہتے ہیں۔

اڈاڈا ۔ ستون۔ یہ عموماً کمزور چھت میں۔ یا گرتی ہوئی چھت میں لگادیتے ہیں۔

اُچھال چھکّا ۔ یہ لفظ ایسی الّھڑ لڑکی کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بہت ہی شوخ و شنگ ہوتی ہے۔

اَٹ ۔ بھرجانا۔ مثلاً۔ گردو غبار میں اَٹ گئے۔ یہ کمرہ دھوئیں میں اَٹ گیا۔

اُڈوائی کھٹوائی ۔ یہ ایسی نازک مزاج عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو شوہر کو ہر وقت چوچلے دکھاتی ہے مثلاً۔ لو اور سنو ذرا کوئی بات ہوئی اور اُڈوائی کھٹوائی لے کر پڑگئیں۔

اٹھارہ بگّی اٹھارہ باگ ۔ یہ ایک قسم کا کھیل ہے جس کو روہیل کھنڈ میں عام لوگ کھیلتے ہیں۔ اس میں چوبیس گوٹیں یا کنکر وغیرہ رکھ کر کھیلتے ہیں۔ اسکی شکل یہ ہے۔ اسے صرف دو آدمی کھیلتے ہیں۔

اَئینتی پائینتی ۔ پلنگ کے سرہانے اور پاؤں کی طرف کی جگہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اَنّا اُپلا ۔ جنگل میں گائے بھینس جو گوبر کرتی ہیں۔ اور جب وہ بغیر ہاتھ لگائے سوکھ جاتا ہے تو اَنّا اُپلا کہلاتا ہے۔

اَٹکن بٹکن ۔ یہ ایک کھیل ہے جس کو چھوٹے چھوٹے بچے آپس میں بیٹھ کر اس طرح کھیلتے ہیں کہ ایک بچہ کہتا ہے آؤ اٹکن بٹکن کھیلیں شہادت کی انگلی اٹھاکر دائیں سے ایک بچہ یہ الفاظ کہتا ہے:۔ ایک دو دن۔ نیبو کی توڑوں لس بنگلوں کا توڑوں تارا تو گن لے پورے بارہ بارہ کی منگائی رسّی تو گن لے پورے اسّی اسّی کے منگائے جو تو گن لے پورے نوّے۔ دراصل بچوں کو گنتی یاد کرانے کا یہ ایک طریقہ ہے۔

اَگولا ۔ گنے کے بالکل اوپر کا حصّہ۔

اَماں ۔ ارے میاں کا مخفف ہے۔

ب

بنگو ۔ ایک درخت کے پھل کی گٹھلی ہوتی ہے جو کہ

لہ اَدا۔ سندھی میں بھائی کو کہتے ہیں۔

سفید الائچی کے برابر ہوتا ہے بچے اس کو چٹکی سے اس طرح گھماتے ہیں کہ ایک منٹ تک گھومتا ہے۔

بھدا - ایک پھل ہوتا ہے چھوٹے خربوزے کی برابر سُرخی مائل۔ عموماً لوگ کم رغبت سے کھاتے ہیں کیونکہ یہ برسات میں ہوتا ہے[1]۔

بہنو - پیار میں بہن کو بہنو کہتے ہیں۔

بہن بہن - اکثر بچے آہستہ آہستہ اپنی بات کی رٹ لگائے جاتے ہیں مثلاً پیسہ دیدو۔ یا روٹی دیدو۔ تو اس کو وہاں کی عورتیں کہتی ہیں کہ کیا بہُن بہُن لگائی ہے۔

بہن بہن - بروزن چلن۔ یہ لفظ بھی ایسے ہی موقع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہ کیا بہن بہن لگائی ہے۔

بھائیں بھائیں - سنسان۔ سناٹا۔ مثلاً۔ یہ گھر تو بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔

بھتّی - مُردے کے مرنے کے دن اعزاء و رشتہ دار جو کھانا بھیجتے ہیں اس کو بھتی کہتے ہیں۔

بھگّا - بٹیر جانور کا نر۔

بھیلی - بھے لی۔ روہیلکھنڈ میں گڑ کو بھیلی کی شکل میں بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً سوا سیر اور ڈھائی سیر کی ہوتی ہے۔ پانچ سیر کا بھیلا کہلاتا ہے[2]۔ اس کے متعلق ایک مثل بھی ہے کہ "گنّا نہ دے بھیلی دے"۔

بھوبل - چولھے کی گرم گرم راکھ کو کہتے ہیں۔

بچھو - جانور بچھو نہیں بلکہ وہاں ایک قسم کی آتشبازی کا نام ہے۔ بچھو چھنچھوندر۔ جب بچے یہ آتشبازی چھوڑتے ہیں تو وہ خود بخود ناچتی ہے۔

بٹنا - مسالہ پیسنے کو مسالہ بٹنا بھی کہتے ہیں۔

پ

پٹ بجنا - جگنو کو کہتے ہیں۔

پیڑھی - پلنگ کی شکل کی بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔ شکل مربع ہوتی ہے عورتیں اس پر بیٹھ کر روٹی پکاتی ہیں یا دھوپ میں بیٹھتی ہیں اس میں ادبان نہیں لگتی ہے۔

پیرا - (پَےرَا) یہ لفظ عموماً عورتیں استعمال کرتی ہیں کہ فلاں عورت کا پیرا کیسا بھاگوان ہے۔ اور فلاں کا پیرا کیسا منحوس ہے۔

پھونسڑا - چادر۔ رضائی وغیرہ میں جو کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے تاگے نکل آتے ہیں اس کو پھونسڑا کہتے ہیں۔

پھونس - اس سے چھپّر بنتا ہے۔ اگر یہ تازہ ہے اس کو کیسرا (کیسے رَا) کہتے ہیں اور جب یہ دو تین سال کا ہو جاتا ہے تو اس کو پھونس کہتے ہیں۔

پنیٹھ - (پینےٹھ) ایسے بازار کو کہتے ہیں جو ہفتہ میں ایک بار یا دو بار کسی جگہ لگتی ہے۔ مثلاً رامپور میں بدھ کے دن پنیٹھ اس مقام پر لگا کرتی ہے جہاں اب رضا کالج ہے۔

پتھی - لہسن کی گانٹھ میں جو اجزار ہوتے ہیں ا[...]

[1] اس کو توئی بھی کہتے ہیں۔ [2] اس کو سرکرا یا بھرا بھی کہتے ہیں

کہتے ہیں۔ اہلِ دہلی اس کو جوا کہتے ہیں[1]۔

پھنگی ۔درخت کا بالکل آخری حصّہ

ت

تیتڑا ۔ (تے تے ڑا) پانی گرم کرنے کا برتن، عام طور سے یہ تانبے کا ہوتا ہے۔ مختلف سائز کا کوئی گھڑے سے بڑا کوئی گھڑے سے چھوٹا۔

تپچی ۔ (تے پ چی) ایک قسم کی کڑھائی کا نام ہے جسے عموماً کُرتے میں سلائی کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔

تتیّا ۔ بھڑ کو کہتے ہیں ۔

توبڑا ۔ایک قسم کا خول جو کہ مجرموں کے منہ پر چڑھایا جاتا تھا مثلاً رام پور میں یہ مشہور ہے کہ جب جرنل عظیم الدین خاں مارے گئے تو ان کے قاتلوں کے منہ پر توبڑے[2] چڑھا دئے گئے۔

تمنیا ۔بچوں کے پائجامے کو کہتے ہیں ۔

تُکّل ۔ایک قسم کا بڑا پتنگ

ٹ

ٹُٹ پونجیا ۔ غریب آدمی

ٹلوا ۔ گیڑی کی قسم۔ جیسے مونیا۔ دوشاخا۔ٹلوا۔ویسے چھوٹی چیز[3]۔

ٹخو ۔ عورتوں کی گالی[4]۔

ٹوم ۔ زیور۔

ج

جبیا ۔ زبان۔

جُروا ۔ جورو۔ بیوی۔

جھونجھڑا ۔ بھوسڑا۔

جھونجھ ۔ایک جانور بیا ہوتا ہے اس کا گھونسلہ جھونجھ کہلاتا ہے۔

جھنجیا ۔رام پور کے کمہار مٹی کا ایک ایسا برتن بناتے ہیں جس میں سیر بھر دودھ آ سکے اس کو "کلیا" کہتے ہیں اس میں بہت سے چھید کر کے اندر چراغ جلا کر اوپر سے ہرا یا سرخ کاغذ چڑھا کر بچے گھر گھر مانگتے ہیں۔ یہ بھی بچوں کا ایک کھیل ہے۔

چ

چپچپڑا ۔ ایک ایسی چیز جو نہ بہت سخت اور نہ بہت نرم مثلاً نہ گڑ چپچپڑا ہے اور نہ حلوہ سوہن اب اس کے درمیان کی جو چیز ہوگی وہ چپچپڑا ہوگی۔

چھچھوندر ۔ایک قسم کی آتشبازی

چورسپاہی ۔ایک قسم کا کھیل۔ جس میں ایک بچہ چور بنتا ہے باقی سپاہی۔

چھوچھک ۔ بچے کی پیدائش پر سامان جو اس کے نانا دادا وغیرہ دیتے ہیں۔

چیکٹ ۔ چراغ کی تلچھٹ ۔ اور جو کپڑا بہت میلا ہو

---

[1] بریلی اور بدایوں میں بھی جوا کہتے ہیں اور پوری گانٹھ کو پنچی یا گرہ کہتے ہیں۔ [2] ٹاٹ وغیرہ کا ایک تھیلا ہوتا ہے جس میں دانہ بھر کر گھوڑے کے منہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ [3] ایک پہیلی ہے "کالے پہاڑ پر ٹلوا ناچے" (اُسترا) [4] بریلی اور بدایوں میں "ٹکو" کہتے ہیں۔ تکنے والی دیدہ باز عورت۔

مثلاً میاں تمہارے کپڑے تو بڑے چیکٹ ہو رہے ہیں۔

چار بیت۔ رام پور کے شعرا ایک قسم کی نظم کہتے ہیں جس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اور اس کو خوش گلو لوگ طبلہ کی دُھن پر گاتے ہیں۔ طبلہ ایک گول گھیرا ہوتا ہے جس پر بکری وغیرہ کی کھال منڈھ لیتے ہیں۔

چکئی۔ لکڑی کی خوبصورت گول بنی ہوئی چھوٹی سی ہوتی ہے۔ جیسے چھوٹی سی چکّی ہو۔ بچے اور کبھی کبھی بڑے بھی اس میں ڈوری ڈال کر کلمہ کی اُنگلی کے اشارے سے پھراتے ہیں۔ اچھا پھرانے والا توسے زیادہ چکر لیتا ہے۔

چکر بھنی۔ بہت زیادہ مصروف آدمی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چکر بھنی چکئی سے نکلا ہے۔

چُنکٹ۔ تھپّڑ۔ طمانچہ۔

چھی۔ چھوٹے بچے کے پائخانے کو کہتے ہیں۔ جیسے ننھے نے چھی کردی۔

چھونچ۔ بُھٹّے کے دانے نکالنے کے بعد جو چیز بچتی ہے اس کو کہتے ہیں۔ رام پور میں بُھٹّے کو بھنڈا کہتے ہیں۔

چونڈا۔ چوٹی کو کہتے ہیں مثلاً کیوں بنّو میرے سفید چونڈے میں خاک ڈلاؤگی۔

د

دَوڑ۔ پولس کے اس دستہ کو کہتے ہیں جو مجرم کو پکڑنے جائے۔ مثلاً کالے خاں کے گھر دَوڑ آگئی۔

دِوُلا (دیا) چراغ۔

دشاخا۔ رام پور میں ایک کھیل ہوتا ہے جس کو گیڑی کہتے ہیں۔ زمین پر لکیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔ دوشاخا ایک گیڑی کا نام ہے۔

ڈ

ڈولی۔ ایک قسم کی سواری جسے کہار اُٹھاتے ہیں اس میں ایک ہی عورت بیٹھ سکتی ہے۔

س

سننا۔ لت پت ہوجانا۔ جیسے کیچڑ میں سَن گئے۔ یا میرے ہاتھ سنے ہوئے ہیں۔

سفری۔ امرود۔

سینڈے۔ کچے خربوزے۔

سرخی۔ عمارت بنانے کا ایک مسالہ جس میں چونا اور سرخی ملاکر بناتے ہیں۔ یہ سیمنٹ کی طرح کام کرتی تھی۔

سوئر گھیٹنا۔ عموماً عورتیں اپنے شریر بچوں کو کہتی ہیں۔

ک

کمرخ۔ ایک قسم کا انتہائی ترش ہشت پہلو پھل۔

کررسی۔ (کرس) اُپلے کا چھوٹا ٹکڑا۔

کنکیا۔ پتنگ کو کہتے ہیں۔

کھٹیا (کھاٹ) چھوٹا پلنگ۔

کول۔ نقب کو کہتے ہیں۔

کوئیا۔ چھوٹا کنواں۔

کھرنجہ۔ گلی میں چوکوں کا فرش۔ وہاں چھوٹی چھوٹی گلیوں میں چوکے لگادئے جاتے ہیں جسے کھرنجہ کہتے ہیں۔

کھنڈسال۔ شکر، گڑ اور کھانڈ بنانے کا کارخانہ

کڑی ۔ لکڑی کا تراشا ہوا ستون جس کو چھت وغیرہ میں
لگاتے ہیں۔ لکڑی کے اس بڑے ستون کو کڑی
اور چونے کو ترک کہتے ہیں۔

کنکر۔ سفید رنگ کا ایک پتھر ہوتا ہے سنگاڑے کے
برابر وہ سڑک بنانے کے کام آتا ہے۔

کیسرا۔ (کیسے سا) یہ ایک قسم کی لمبی لمبی گھانس ہوتی ہے
جس سے چھپر بناتے ہیں۔ اس کے گانٹھوں کو
"پولا" کہتے ہیں۔

کھوئی ۔ چوسی ہوئی گنڈیری۔

کھچڑی۔ دال چاول کی ملاوٹ ہی کو نہیں کہتے۔ داڑھی
کے بالوں کو بھی کھچڑی کہتے ہیں۔

کھکوسٹ۔ ایک جانور ہوتا ہے۔ مگر عموماً خراب آدمی کے
لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فلاں بڑا کھکوسٹ
ہے۔ یا بڈھا کھوسٹ۔ یعنی بہت بوڑھا۔

گ

گلگچیا (گرگچیا) چھوٹی مینا کو کہتے ہیں۔ ایک جانور۔

گھیر ۔ گھیرا ۔ محلہ۔ مثلاً فتح کا گھیر۔ (فتح کا دائرہ)

گدّا ۔ درخت کا تنا

گلتھی ۔ پتلے چاول۔

گیڑی۔ ایک کھیل کا نام زمین پر لکیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔
عام طور سے شیشم کے درخت کی گیڑیاں عمدہ
ہوتی ہیں۔

گلگوتھنا۔ موٹے تازہ بچہ کو کہتے ہیں۔

گھئی ۔ چولھے کی ایک کروٹ۔ مثلاً روٹی گھئی میں سکھنا
یا گھئی کی سکی روٹی اچھی ہوتی ہے۔

ل

لنگڑا۔ ایک کھیل کا نام جسے بچے کھیلتے ہیں[1]۔ تاگے میں
چھوٹا پتھر باندھ کر آپس میں لڑاتے ہیں اب جبکہ
تاگہ کٹ جائے۔ گویا یہ زمین کا پتنگ ہے۔

لبّا داس۔ ایک کھیل کا نام جس میں ٹانگ کے نیچے
سے لکڑی پھینکی جاتی ہے۔

لمڈورہ۔ ایک جانور کا نام

لپُوسے۔ ایک پھل کا نام جسے عموماً بچے ہی کھاتے
ہیں۔ لڈو کی برابر سرخی مائل ہوتا ہے۔

لچکچُ۔ ایک درخت کا پھل ہے جسے گوشت میں
پکاکر کھاتے ہیں۔

م

مراتی۔ عورتوں کا لفظ یعنی مرا ہوا۔ یہ کبھی کبھی کوسنے کے
معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مرجھلا۔ دُبلا پتلا۔

میت۔ مسجد۔

مونڈھن۔ بچے کے پہلی دفعہ بال مونڈھنے پر جو رسم ادا
کی جاتی ہے اس کو مونڈھن کہتے ہیں۔

مونڈھا۔ کرسی یا اسٹول کی طرح سینٹوں کا بنا ہوا ہوتا ہے۔

میّا ۔ ماں۔ والدہ

ن

نگوڑا۔ عورتوں کا مخصوص لفظ یعنی بچارا۔

نو بجی نو باگ۔ یہ بھی ایک کھیل ہے جس نو گٹیئں
ہوتی ہیں۔

---

[1] لنگڑا لڑانا بچوں کو بہلانا۔

نٹنی ۔ نٹ ایک قوم ہوتی ہے ان کی عورتیں عام طور سے پیشہ کراتی ہیں ۔ اور نٹنی کہلاتی ہیں ۔

نچکیا ۔ ناچنے والا ۔

نیلکنٹھ ۔ ایک جانور کا نام جو کہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے

ہ

ہود ۔ دور کی آواز

ہوری ۔ تخاطب مثلاً ۔ ننھے خاں ہوری ۔

ہوکا ۔ ہوس ۔

ہونڈار ۔ ایک جانور کا نام

ہنسیا ۔ درانتی ۔

ہینچنا ۔ یہ لفظ ایسے موقع پر بولتے ہیں ۔ مثلاً باجرے کا آٹا خوب ہینچا تاکہ اچھی روٹی پکے ۔ مکا کا آٹا جب تک خوب نہ ہینچے روٹی بڑھتی نہیں ۔

کانفرنس اکیڈیمی کا خیر مقدم

محترمہ بیگم شاہ نواز صاحبہ

آپ کی کانفرنس کی اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی کتابیں بہت کارآمد اور دلچسپ ہیں ۔ آپ کی قومی خدمت بے حد قابل قدر ہے ۔ قوم ایسے سپوتوں پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے ۔

مرزا حسن حبیب صاحب ڈپٹی ایجوکیشن سکریٹری مغربی پاکستان لاہور

کانفرنس اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی مطبوعات موصول ہوئیں ۔ میری رائے میں ان کتابوں کو شائع کرکے کانفرنس نے ایک حقیقی خدمت انجام دی ہے ۔ مزید شائع ہونے والے تراجم بھی مجھے یقین ہے اسی قدر اہم ہوں گے ۔ کیونکہ وہ صحیح معنوں میں کلاسیکی ادب میں شامل ہیں اور ان کے اردو ترجمے ہمارے قومی ادب کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ ہوں گے ۔ ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اقدام لائق ستائش ہے ۔

سید ہاشم رضا صاحب سٹلمنٹ کمشنر

اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مرسلہ مطبوعات موصول ہوئیں میں نے ان کو بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا ۔ یہ کتابیں ادب حاضرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہیں

مرزا عاشق حسین صاحب ایم ۔ اے ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم کراچی

ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کراچی نے اسکول لائبریریوں اور انعامات کے لئے اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی شائع کردہ کتابیں ۔ ۱ ۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں ۔ ۲ ۔ اسلامی نظام تعلیم ۔ اور مسلم خواتین کی تعلیم منظور کی ہیں ۔ (صوبہ مغربی پاکستان کی اسکول لائبریریوں اور انعامات کیلئے بھی یہ کتابیں منظور ہو چکی ہیں ۔

اُستاذ العلما حضرت مفتی لُطفُ اللہ صاحبؒ کے

علمی کارنامے اور کمالات

از

مولانا بدر الدین صاحب علوی سابق اُستاذ عربی مسلم یونیورسٹی

معارف بابت ماہ نومبر ۱۹۳۶ء میں کلام لطف کے عنوان سے میرا ایک طویل مقالہ نکلا تھا جو اسی نام سے بہ شکل رسالہ علیحدہ بھی شائع ہوا، میں نے اس کی تمہید میں لکھا تھا کہ استاذ العلما کی سوانح کا ایک نہایت اہم باب ان کے علمی کارناموں کا ہے، اور وعدہ کیا تھا کہ اس باب کو ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا۔ عرصہ دراز گزر گیا، اس دوران میں استاذؒ کے متعلق مختلف عنوانات کے ساتھ قلم جنبش بھی کرتا رہا اور مضامین معارف میں نکلتے رہے، مگر وعدہ وفا کرنے کی نوبت نہ آئی، جس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ کلّ امرٍ مرھونٌ بوقتہ حال میں ایک روز وعدے کا خیال آکر عزم پختہ ہو گیا اور اس طرح پر توفیق رفیق ہوئی، فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اُستاذ العلماء کے علمی کارنامے جن کو میں اب علمی کمالات اور خصوصیات سے تعبیر کروں گا، اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا استقصا نہایت دُشوار ہے، میری طاقت سے بالاتر ہے۔ کہ میں ان کو کما حقہٗ لکھ سکوں، میری طاقت سے بالاتر ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے جس زمانہ میں فیض حاصل کیا وہ حضرت کی نابینائی اور معذوری کا تھا، بہت سے کمالات اور خصوصیات جن کا تعلق بینائی اور طاقت سے ہے، میں ان کا مشاہدہ نہیں کر سکا، میں نے ایسے کمالات کو ان بزرگوں سے سُنا جنھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، بہر حال مالا یدرک کلہ لا یترک جلہ کے بموجب جو کچھ ہو سکتا ہے پیش کرتا ہوں۔

حضرت اُستاذ کے علمی کمالات دو قسموں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک وہ جو مخصوص درس و تدریس اور تقاریر مقالات مشکلہ سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو درس کے متعلق نہیں بلکہ عمومی حیثیت رکھتے ہیں جیسے صحیح الفاظ اور علمی نکات و لطائف وغیرہ۔

قسم اول کے کمالات و خصوصیات متعلقہ درس

سب سے پہلی خصوصیت یہ تھی کہ خواہ کتنی ہی وزنی کتاب ہوتی اس کو اپنے ہاتھ میں رکھتے، بغیر کتاب اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہرگز نہ پڑھاتے، دوسری یہ کہ نفس کتاب اور مطلب سے تعلق ہوتا، خارجی مباحث جن سے اُلجھ پیدا ہو اور نفس مضمون سے علیحدہ ہو جانا پڑے ان کو پاس کبھی نہ پھٹکنے دیتے۔

تیسری یہ کہ مطلب محض الفاظ کتاب سے نکالتے، جس میں

خارجی امداد کہیں کی شامل نہ ہوتی، ان ہی دوسری اور تیسری خصوصیات کے لئے کتاب ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت تھی، اس زمانہ کے متعدد علماء کا طریق درس یہ تھا کہ کتاب ہاتھ میں نہ رکھتے اور طالب علم ایک مسئلہ کے متعلق جب پوری عبارت پڑھ چکتا تو وہ تقریر کرتے، چوتھی یہ کہ جماعت میں مختلف الفہم لوگ ہوتے، کوئی فہیم، کوئی متوسط کوئی کم سمجھ، لیکن تقریر اور تفہیم کا انداز وہ ہوتا جو کم سمجھ والوں کے لئے موزوں ہوتا، اس کی وجہ سے بعض وقت کوئی فہیم کبیدہ بھی ہوجاتا مگر اس کی پروا نہ کرتے، پانچویں یہ کہ طلبہ کو اجازت تھی کہ بے تکلف جو اعتراض چاہیں کریں کتنے ہی اعتراض ایک یا متعدد طلبا کرتے کبھی ناگوار نہ گزرتا برابر سنجیدگی کے ساتھ جواب دیتے جاتے، پیشانی پر بل بھی نہ پڑتا، غصہ کا کیا کام، ایک بار کوئی طالب علم کسی مقام پر بہت دیر تک اُلجھا رہا، جواب دیتے رہے تا آنکہ وہ مطمئن ہوکر آگے بڑھا، اور پڑھتے ہی پھر اُلجھا، دوسرا کوئی استاد ہوتا تو غصہ میں آکر ایک بار جھڑک دیتا اور اس کے اُلجھنے کی پروا نہ کرکے سبق آگے چلاتا کیونکہ پہلے اُلجھاؤ میں بہت وقت برباد ہوچکا تھا لیکن دوسری بار اس طالبعلم کے اُلجھنے پر مسکرا دیئے اور یہ شعر پڑھا۔

ایک آفت سے تو مرمر کے ہوا تھا جینا
پڑگئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

گویا یہ شعر پڑھ کر جو کچھ غصہ طبیعت میں رہا ہوا اسکو فرو کردیا اور "ہاں" فرما کر اس کے اُلجھاؤ کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوگئے اور مطمئن کرکے آگے بڑھے۔ چھٹی یہ کہ طلباء کے اعتراضات اور شبہات کو نہایت سلامتی کے ساتھ دفع فرما کر نفس مضمون کو صاف اور بے خلش کردیتے، ہمیشہ تحقیقی جواب دیتے، کبھی الزامی جواب نہ دیتے، ساتویں یہ کہ مشکل مقامات کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے جس سے طالب علم کو یقین ہوجاتا کہ مصنف کا مقصد یہی ہے جو حضرت نے سمجھایا، یہ بھی فرماتے کہ میں چاہتا ہوں کہ طالب علم کو اتنا ہی سمجھاؤں جتنا میں خود سمجھا ہوا ہوں۔ آٹھویں یہ کہ جب تک جماعت کا ہر طالب علم اپنے اطمینان کا اظہار نہ کردیتا خواہ آسانی سے خواہ اعتراضات اور جوابات کے بعد، اُس وقت تک سبق آگے نہیں بڑھتا تھا، بعض اوقات ردوکد کی وجہ سے ایک ہی سبق میں گھنٹوں گزر جاتے، مگر اس کی کوئی پروا نہ کرتے اور نہ اس کی وجہ سے سبق کی مقدار کم کرتے، بلکہ مقررہ مقدار پوری کرکے ہی چھوڑتے، نویں یہ کہ جس زمانہ میں درس پوری قوت و انہماک سے جاری رہتا، بیس بیس اور بائیس بائیس سبق روزانہ پڑھاتے، جن میں سب کتابیں اعلیٰ درجہ کی ہوتیں، باوجود اس بڑی تعداد کے تکان کا شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا، جس توجہ سے پہلا سبق ہوتا اسی توجہ سے آخری سبق بھی ہوتا، ایک سبق تو فجر کی نماز سے پہلے ہی ہوچکتا، بعد نماز فجر اسباق کا جو سلسلہ شروع ہوتا تو تلے اوپر اسباق ہوتے، یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہوجاتا، کھانا مکان سے مدرسہ میں آجاتا جو جامع مسجد میں تھا، اور حضرت کھانا کھاکر پھر اسباق میں لگ جاتے، اب یہ سلسلہ ظہر کی نماز کے وقت رُکتا، ظہر کے بعد پھر عصر تک اور عصر کی نماز کے بعد سے مغرب تک، پھر مغرب سے فارغ ہوکر عشاء کی

نماز تک برابر اسباق ہوتے رہتے، عشا کے بعد مکان
تشریف لے جاتے تو بعض اوقات راہ میں بھی کوئی
سبق ہوتا، یہ حالت درس کی سالہا سال رہی، سال
دو سال چار سال نہیں، خیال کرنے کا مقام ہے کہ کسی
طاقت اللہ تعالےٰ نے عطا فرمائی تھی جو تکان کا نام بھی
نہ آنے پاتا تھا، اللہ اکبر، دسویں یہ کہ پڑھانے میں برکت
تھی، باوجود اس کے کہ ناغے بھی ہوتے تاہم کتابیں ان
مدارس کے مقابلہ میں جلد ختم ہو جاتیں، جہاں ناغے نہ
ہوتے، اس کا تجربہ خود مجھ کو ہوا، کہ میرے لئے قرار پایا تھا
کہ صرف دو سطریں پڑھا کروں گا، میبذی کا سبق میں نے
شروع کیا تھا، مدرسہ میں میبذی میرے شروع کرنے سے
پہلے شروع ہو چکی تھی، اور جب میں میبذی ختم کر چکا تو
معلوم ہوا کہ مدرسہ میں ابھی الہیات تک ہوئی ہے برکت
کے اور واقعات بھی ہیں، لیکن میں نے بخوف طول سب
چھوڑ کر صرف ایک اپنے واقعہ پر اکتفا کی، بہرحال اس
برکت کی وجہ سے ایک مخلوق فیضیاب ہو کر نکلی اور جو
بھی نکلا کامل فیضیاب ہو کر گیا، گیارہویں یہ کہ اگر کسی
سبق کا کوئی حصہ ایسے مسئلہ پر مبنی ہوتا جو خارج از کتاب
ہو تو سبق سے پہلے مبنی علیہ کو ذہن نشین کرا دیتے، اس
کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پڑھتے وقت مسئلہ بہت صفائی کے
ساتھ واضح ہو جاتا۔ بارھویں تمام علوم کے مسائل مستحضر
تھے، جب کبھی کوئی مسئلہ کسی علم کا آ جاتا تو برجستہ اس کی
تقریر مع مالہ وما علیہ کے فرما دیتے۔ تیرھویں یہ کہ تقریر
کے الفاظ حشو و زوائد سے پاک ہوتے، بعض اوقات
کتاب کی عبارت کے برابر ہی تقریر کی عبارت ہوتی،
چودھویں یہ کہ کتاب کا مضمون حتی الوسع صحیح ثابت کرتے
اور اس کو غلط نہ ہونے دیتے، فرماتے کہ "شیشہ کا بنانا
کمال ہے توڑ دینا کمال نہیں"۔ پندرھویں یہ کہ اگرچہ زیادہ تر
اسباق علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ، علم کلام اور ریاضی کی
بڑی بڑی کتابوں کے ہوتے، لیکن علوم نقلیہ، ادب،
فقہ، اصول، حدیث و تفسیر میں تمام وہی خصوصیات
بوقت درس ملحوظ رہتیں جو علوم عقلیہ میں ہوتیں،
سولھویں یہ کہ تمام علوم و فنون کے جامع تھے، سب کا
درس یکساں دیتے، طالب علم جو فن بھی پڑھتا عقلی یا
نقلی سمجھتا کہ حضرت مخصوص طور پر اسی فن کے ماہر ہیں،
دوسرا فن ایسی مہارت سے نہ پڑھاتے ہوں گے، مگر جب
دوسرا فن پڑھتا تو دیکھتا کہ اس میں بھی وہی کمال حاصل ہے
جو پہلے میں دیکھ چکا، طلبا جو اسباق میں ہوتے وہ اکثر
فارغ التحصیل عالم اور بعض فنون کے ماہر ہوتے، اسلئے
ان کو پڑھانا آسان کام نہ تھا، مولانا بشیر احمد صاحب
بیان کرتے تھے کہ ان کے اُستاذ مولوی عبدالقدوس
صاحب پنجابی جب علی گڑھ آئے تو فارغ التحصیل تھے
اور صرف و نحو کے تو بڑے ماہر اور ان فنون کی غیر
متداول کتابیں مطالعہ کئے ہوئے، مولوی صاحب
نے اس بات کی جانچ کرنے کے لئے کہ جو کچھ سنا تھا اور
جو شہرت ان کو کھینچ کر پنجاب سے علی گڑھ لائی وہ صحیح ہے
یا غلط، مختلف اسباق میں بیٹھ کر دیکھنا شروع کیا، اتفاق
سے پہلا سبق جس میں وہ شریک ہوئے شرح جامی کا
تھا، غیر متداول کتابوں میں جو اعتراضات تھے، دھڑا دھڑ
کرنے شروع کر دیئے، مگر برجستہ سب کے صحیح جوابات

پاتے گئے، اس طور پر کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حضرت ان سب کتابوں پر نظر رکھتے ہوئے ان چیزوں کو دماغ میں محفوظ کئے ہوئے تھے، حالانکہ ان کتابوں کا وجود اس ملک میں نہ تھا، آخرکار ربن ختم ہونے پر حیرت زدہ ہوکر سرخم کردیا اور ان علوم میں جن میں ان کو ادعا تھا لوہا مان گئے، اسی طرح دوسرے علوم میں بھی ہوا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی عبدالقدوس صاحب حد سے زیادہ عقیدت مند ہوگئے، چونکہ جابجا مشہور مدرسین کی جانچ کرتے ہوئے علی گڑھ پہنچے تھے، لہذا اتنی عقیدت ہوگئی کہ بجز حضرت کے کسی کو تسلیم ہی نہ کرتے تھے، ان کی عقیدت کے واقعات کسی اور جگہ آئندہ لکھے جاویں گے۔

دوسرا واقعہ علوم میں بے مثل کمال کا مفتی عبداللطیف صاحب مولانا محمد علی صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت مفتی عنایت احمد صاحب جب کانپور میں مولانا سید حسین شاہ بخاری اور استاذ العلماء کو اپنا جانشین کرکے حج کو تشریف لے گئے تو مولانا محمد علی صاحب سبق شرح جامی کا شاہ صاحب کے پاس ہوتا تھا، اکثر افہام وتفہیم میں اُلجھاؤ پیدا ہوجاتا۔ اور دو دو تین تین دن تک سبق آگے نہ چلتا، مجبور ہوکر مولانا محمد علی اُستاذ العلما کی طرف رجوع کرتے، بیان یہ کرنا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا کہ اُستاذ العلما فوراً تقریر فرماکر خلش نکالدیتے احیاناً یہ بھی ہوتا کہ فرماتے کتاب چھوڑ جاؤ اور پھر کسی وقت آنا، اس کے بعد جب اس مقام کی تقریر فرماتے تو مولانا محمد علی صاحب کا فرمانا تھا کہ ہم لوگ بے ساختہ واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہوجاتے

تیسرا ایک اور واقعہ مفتی عبداللطیف صاحب سے سُنا ہوا یہ روایت مولانا محمد علی یہ ہے کہ مولانا محمد علی کو بعض اوقات ہدایہ اخیرین میں شبہات ہوتے جو کسی طرح حل نہ ہوتے، ہدایہ اس زمانہ میں غیر محشیٰ تھا، اُستاذ العلماء سے استفسار کا موقعہ یوں نہ ملتا کہ مسلسل اسباق میں مصروف ہوتے، اکثر اُس وقت موقع ملتا حضرت جب نمازِ عصر کے لئے وضو کرنے کے لئے حوض پر آتے، اور وضو سے فارغ ہوچکتے اور نماز میں کچھ وقفہ ہوتا، اسی وقفہ میں مولانا عرض کرتے کہ ہدایہ میں فلاں مقام پر شبہ ہے، حضرت فوراً بغیر سُنے ہوئے فرماتے کہ ہاں یہ شبہ ہوگا، اس کو بیان کردیتے اور اس کا جواب دے کر اطمینان کردیتے، خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ کتنا بڑا کمال تھا کہ بغیر شبہ سنے ہوئے شبہ اور جواب سب کچھ اتنے تھوڑے سے وقفہ میں بیان کرکے مطمئن کردیتے سترھویں یہ کہ پورے ذوق اور کامل لذت کے ساتھ دکھا دیتے، اٹھارھویں یہ کہ صحیح بخاری کی کتاب التفسیر سے مخصوص یہ بات تھی کہ آیتوں کے جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جابجا سے لئے گئے ہیں وہ آیتیں پوری برجستہ تلاوت فرماکر طلبا کو سنا دیتے، اس طور پر جو اشکال سمجھنے میں ہوتا ہے وہ ہونے ہی نہ پاتا، اُنیسویں مخصوص فن ریاضی کے تعلق یہ کہ اس دقیق ونازک فن کو اس طرح پڑھاتے کہ کوئی اشکال باقی نہ رہتا، جس کی صورت یہ ہوتی کہ کاغذ یا لکڑی پر اشکال تیار کرکے سمجھاتے، بیسویں یہ کہ ان اشکال کو برجستہ بغیر آلات کی مدد کے نہایت صحیح اور عمدہ بناتے کہ لوگ ایسی اشکال عمدہ آلات کی مدد سے

بھی نہیں بنا سکتے ، یہ اشکال بنا کر طلبہ کو دے دیتے ،
اپنے پاس نہ رکھتے ، اکیسویں یہ کہ افہام و تفہیم کا ملکہ نہایت
اعلیٰ درجہ کا تھا ، اس کا شہرہ دور دور تھا ، اسی وجہ سے
کشمیر ، بخارا اور عرب ، تمام اقطاع عالم سے طلبا کھنچ کھنچ کر
چلے آتے تھے ، اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے
کہ کوئی مدرس عرب میں یا کسی اور اسی طرف کے ملک
میں کچھ پڑھا رہے تھے ، ہر چند کوشش کی کہ طالب علم کو
مطلب سمجھا دیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا ، مجبور ہو کر اُستاد
کی زبان سے نکلا کہ میں مولوی لطف اللہ کیسے ہو جاؤں ، جو
تجھ کو سمجھا دوں ، یہ سن کر اس نے تفتیش کی اور علی گڑھ خدمت
میں پہنچ کر فیضیاب ہوا ، بائیسویں یہ کہ طلبا کی ذہنیت کے
بڑے ماہر تھے ، اور خوب جانتے تھے کہ کس طرح مطلب ان
کے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے ، چنانچہ بہت آسانی سے اسی
طور پر سمجھاتے ، اگر طالب علم کے بشرے سے اندازہ کرتے کہ
ابھی نہیں سمجھا ، محض شرم کی وجہ سے سمجھ لینے کا اقرار کر رہا ہے
تو تا وقتیکہ اس کے سمجھ لینے کو محسوس نہ فرما لیتے برابر تفہیم کو
جاری رکھتے ، تئیسویں یہ کہ مستفید ہونے والے حضرت پر
شیفتہ و فریفتہ ہو جاتے ، میں نے جن شاگردوں کو دیکھا اور
سنا ان کی شیفتگی کا استقصائی بیان غیر ممکن ہے ، چند واقعات
بیان کرنے پر اکتفا کروں گا ، اول مولوی عبدالقدوس پنجابی
کا جن کا ذکر اوپر آ چکا ، مولوی بشیر احمد صاحب ان کی
شیفتگی کے واقعات سنایا کرتے تھے ، مثلاً اُستاذ العلماء کی
عادت تھی کہ سکونت کے مکان کو اکثر بدلا کرتے تھے ، جب
بھی مکان بدلتے گھر کا سامان جس میں بڑے بڑے صندوق
بھی ہوتے مولوی عبدالقدوس صاحب خود اپنے سر پر
لاد کر ادھر سے اُدھر لے جاتے اور اس خدمت کو باعث
فخر سمجھتے ، دوسرے مولوی احمد حسن کانپوری جن کے واقعات
میں نے مولوی امانت اللہ صاحب اور دوسرے علماء سے
سُنے ، ایسے عاشق اُستاد تھے کہ کانپور سے برابر علی گڑھ
آیا کرتے ، کیونکہ بے زیارت اُستاد ان کو چین نہ پڑتا تھا ،
ایک بار ان کے پیر حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے معقولات
کے پڑھانے سے منع کیا ، انھوں نے اسباق بند کر دیے ۔
طلباء میں بڑا ہیجان پیدا ہوا اور شکایتوں کا ہجوم استاذ العلما
کے پاس ہوا ، بالآخر ایک پرچہ لکھ کر بھیجا کہ "مولوی احمد حسن
معقولات پڑھانے میں کیا مضائقہ ہے ، لوگ تم سے پڑھنے
کی خاطر گھر بار چھوڑ کر آئے ہوئے ہیں پڑھانا شروع کر دو"
پرچہ پاتے ہی کانپور سے علی گڑھ پہنچے اور اپنے دونوں
ہاتھ رسی میں باندھ کر دالان کے کھمبے میں بندھوا دیئے
اور رونا شروع کر دیا ، اُستاذ العلماء کو اندر خبر پہنچی
تو باہر تشریف لائے اور سبب استفسار کیا ، مگر گریہ
کے باعث زبان نے یاری نہ دی ، بڑی مشکل سے اتنا کہہ
سکے کہ قصور معاف فرمائیں اور اپنے دست مبارک سے
ہاتھوں کے بند کھول دیں ، حضرت نے فرمایا قصور ہی کیا ہے
مگر خیر ان کے اصرار پر معافی دی اور ہاتھ کھول دیئے ،
جب طبیعت قرار پر آئی تو بتایا کہ معقولات کا درس بند
کر دینا قصور تھا ، اس کی معافی کے لئے یہ سب کچھ کیا ،
ایک اور عادت مولانا احمد حسن کی یہ تھی کہ پڑھانے میں اگر
کہیں کوئی اشکال معلوم ہوتا تو فوراً سبق روک کر فرماتے
کہ علی گڑھ اُستاد کی خدمت میں جا کر اشکال حل کر آؤں
اُس وقت پڑھاؤں گا ، چنانچہ فوراً علی گڑھ اُستاد کی

واپس جاتے اور اس میں مطلق شرم نہ کرتے، پیر سے بہت عقیدت تھی اور استاد سے بھی عشق تھا، مگر استاد کو تقدم تھا، چنانچہ اپنا نام یوں لکھتے۔ احمد حسن لطف اللہ العام دامادہ العام۔

مدرسہ فیض عام کے جلسۂ تکمیل میں جب حضرت جوتے اُتار کر فرش پر بیٹھے تو مولوی احمد حسن صاحب نے سارے مجمع کے سامنے حضرت کے جوتے اپنے سر پر رکھ لیے،

تیسرے مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب پیشوائے پنجاب، سجادہ نشین گولڑا ضلع راولپنڈی، استاذ العلماء کے انتقال سے تقریباً چھ ماہ پیشتر اُستاد کی زیارت کو مع مریدین اور شاگردوں کے علی گڑھ آئے، میں بھی ان کی دید سے بہرہ مند ہوا، جس وقت وہ خدمت میں حاضر ہوئے وہ سماں قابل دید تھا، اللہ اکبر اتنی عقیدت! پیر صاحب پیر ہونے کے علاوہ اپنے اطراف کے زبردست عالم بھی تھے، اسناد حدیث کا رسالہ اوائل جس کی اجازت حضرت سے لی تھی نقل کر کے بھیجنے کو میرے سپرد فرمایا تھا، چنانچہ میں نے تعمیل کی، اسی سلسلہ میں ایک خط ان کا میرے پاس آیا جو اس وقت تک محفوظ ہے، اور جس کو یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں،

محبت و مودت آئین جناب مولوی بدرالدین صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ، عنایت نامہ کا شکریہ، خصوصاً حضرت قبلہ حفظکم اللہ تعالیٰ کی کیفیت مزاج عالی سے بذریعہ نیاز نامہ اطلاع حاصل کروں، الحمد للہ والمنۃ کہ ملاحظہ عنایت نامہ جناب سے خورسندی حاصل ہوئی، حضرت قبلہ مدظلہم کی خدمت میں تسلیمات و نیازہا عرض کریں، اور بخدمت حضرات صاحبزادگان تسلیمات و نیازہا،

رسالہ مرسلہ جناب پہنچا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب کو مکروہاتِ زمانہ سے مامون و مصئون فرما کر موجبات رضا و کفا عطا فرمائے۔

بظاہر اس بے ہیچ نے حضرت قبلہ مخدومی و مخدوم الکل حفظہم اللہ تعالیٰ مع المتعلقین کی خدمتِ عالیہ میں شمس بازغہ، صدرا، شرح چغمینی، قدرے ہدایہ اور چند سبق جلالین کے پڑھے اور سنے مگر فی الحقیقت حضور مدظلہم کی قلبی توجہ و عنایت نے بہت کچھ حاصل کرا دیا، جس کے اظہار سے لسان القلم والکلم عاجز ہے، والسلام!"

چوتھے شاگرد مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، نواب صدر یار جنگ جن کی کوئی مجلس اُستاد کے ذکر سے خالی نہ ہوتی، اُستاد کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اُستاد بھائیوں سے بھی بے حد محبت کرتے، ان کی شیفتگی کا ذکر میں نے اپنے ان مضامین میں کچھ تفصیل سے کیا ہے، جو معارف اور اخبار جمہور کے صدر یار جنگ نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ کو ختم کرنے سے پہلے مولانا محمد علی صاحب بانی ندوۃ العلماء کا نام شامل نہ کرنا ناانصافی ہوگی جو اُستاد کے بڑے عاشق تھے۔ اور ہر موقع پر اُستاد کے ساتھ شریک ہونا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

جو بیسویں یہ کہ استاذ العلماء کے درس سے مستفید ہو کر اتنی بڑی جماعت نکلی جس کا شمار اور احصا غیر ممکن ہے شروانی صاحب مرحوم نے جو رسالہ سوانح کا لکھا ہے، اس میں شاگردوں کی کثرت کی بابت جو کچھ لکھا ہے بعینہٖ اُس کا

نقل کر دینا بہتر سمجھتا ہوں" دریا معروف موجیں رہا امواج کا شمار کون کرتا، مولوی احمد الدین ولایتی نے بیان کیا کہ صوبۂ سرحد کے ایک وسیع قطعہ کے شاگردوں کا شمار کیا گیا تو معلوم کہ شاگردوں اور شاگردوں کے شاگرد ڈھائی سو کی تعداد میں معروف تدریس تھے"،

پچیسویں اس درس سے مستفید ہونے والوں میں خود بڑے بڑے اصحاب درس پیدا ہوئے جنہوں نے بالاستقلال فیوض کے دریا جاری کئے، مناسب ہے کہ اس جگہ بطور مشتے نمونہ از خروارے، چند مشہور اصحاب درس شاگردوں کے نام لکھ دیئے جائیں۔

مولوی احمد حسن صاحب کانپوری، مولوی فضل حق صاحب رامپوری، مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مفتی عبداللطیف صاحب، مولوی عبدالجمیل صاحب ولایتی، مولوی عبدالقدوس صاحب پنجابی، مولوی نور محمد صاحب پنجابی، مولوی الٰہی بخش صاحب پنجابی، مولوی فضل احمد صاحب افغانی، مولوی بشیر احمد صاحب، مولوی قمرالدین صاحب اجمیری، مولوی راغب اللہ صاحب پانی پتی، مولوی محمد اسحٰق صاحب سنبھلی، مولوی ماجد علی صاحب، مولوی محمد عثمان وزیری، مولوی پیر مہر علی شاہ صاحب، مولوی امان اللہ صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمٰن صاحب ولایتی، مولوی لطف الرحمٰن صاحب بردوانی، مولوی احمد الدین صاحب ولایتی، مولوی محمد علی صاحب کانپوری، مولوی عبدالغنی خاں صاحب، صاحبزادگان مولوی عنایت اللہ صاحب و مولوی امانت اللہ صاحب، مولوی اسحٰق صاحب پٹیالوی، مولوی عبدالحق صاحب حقانی، مولوی وحیدالزماں خاں صاحب، مولوی آل حسن صاحب مرادآبادی، مولوی پردل خاں صاحب، قاضی سعدالدین صاحب کشمیری وغیرہم،

چھبیسویں یہ کہ اللہ نے درازیٔ عمر عطا کی اور صحت و قوت وافر بخشی اور سارا زمانہ تدریس میں صرف فرمایا، تقریباً ستر سال درس دیا،

ستائیسویں تقریر ایسی کرتے کہ بڑے مشکل مضامین پانی ہو کر رواں ہو جاتے، مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی نے "استاذ العلماء" میں دو واقعے اس سلسلہ میں بیان کئے ہیں، ان کو نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، ایک واقعہ صاحبزادہ مولوی امانت اللہ صاحب کا بیان کردہ ہے، کہتے ہیں شرح چغمنی کے پڑھانے میں ایک دائرہ کے متعلق اشکال پیش آیا، حاضر خدمت ہو کر مشکل پیش کی، فرمایا "امانت اللہ! اب دماغ کہاں رہا، خیر ایک لوٹا مٹی کا لے لو" لوٹا لایا گیا، ایک ہاتھ پر اُلٹا کرکے کرہ بنا لیا، دوسرے ہاتھ کی اُنگلی کو کروی حرکت دی، صاحبزادہ کا بیان ہے کہ اُنگلی کا حرکت کرنا اور مسئلہ کا سمجھ میں آنا گویا ایک ہی بات تھی، دوسرا واقعہ مولوی معین الدین صاحب اجمیری نے ذکر کیا، میر زاہد کی ایک تقریر باوجود مکرر غور کے سمجھ میں نہیں آتی تھی، حاضری کے وقت اشکال پیش کیا، سنتے ہی فرمایا کہ اس مسئلے کے متعلق اوپر کے مقدمات کی تقریر میں فلاں غلطی ہوئی ہے، اس کی تقریر اس طرح کرو حل ہو جائے گا، چنانچہ تقریر زاہد کا مضمون صاف ہو گیا" (از استاذ العلماء ص، المطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ)

اٹھائیسویں یہ کہ قوتِ حافظہ انتہا درجہ کی تھی، جو

چیز ایک بار دیکھ لی، دماغ میں پختہ ہوگئی، نسانۃ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور کا جب شائع ہو کر آیا تو مفتی عنایت احمد صاحب نے فرمایا کہ تھوڑا تھوڑا فرصت کے پڑھ کر سنا دیا کرو، اس کے بعد پھر کبھی اٹھا کر نہ دیکھا، مگر آخر تک اسکی عبارتیں کی عبارتیں یاد تھیں، جن کا مخصوص طور پر یاد کرنے کے بعد بھی اتنے عرصہ تک یاد رہ جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا، اس طرح نظیر اکبر آبادی کا کلام لڑکپن میں دیکھا تھا۔ وہ بھی جا بجا سے از بر تھا، ایک بار اس کے اشعار سنائے جن میں سے ایک مجھے اب تک یاد ہے،

یہ جو چڑیاں سانجھ سویرے چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں

چوں چوں چوں چوں چلاچوں کیا سب بچپن بچپن کرتی ہیں

ایسی غیر متعلقہ چیزوں کے محفوظ ہونے سے قیاس کرنا چاہیئے کہ علوم میں کیا حال حافظ کا ہوگا۔ مجھکو بحالت نابینائی پڑھانا ان ہی کا کام تھا، جس سے قوتِ حافظہ کا ثبوت ہوتا ہے،

انتیسویں یہ کہ معاصرین اور علمائے وقت کو حضرت کے کمالِ درس اور دوسرے کمالات کا اعتراف تھا، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے بہت تعلقات تھے، مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے بہت دوستی تھی، مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی جو کتاب لکھتے اس کا ایک نسخہ تہذیبہ کی عبارت اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا کرتے، شرح ہدایۃ الحکمۃ کا نسخہ جو انھوں نے بھیجا وہ میں نے خود دیکھا، اور اس پر تہذیبہ کی یہ عبارت مرقوم ہے،

"ھذہ البضاعۃ المزجاۃ من العبد الضعیف المعتصم بحبل اللہ المقوی محمد عبد الحق العمری الخیر آبادی تاب اللہ علیہ وغفر لہ و لوالدیہ الی الجناب المعظم ذی الفضل والجاہ المولوی محمد لطف اللہ ادام اللہ بقاءہ و زاد فی مصاعد الفضل والکمال ارتقاءہ"

مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے اپنے صاحبزادوں کو حضرت کی خدمت میں تحصیل علم کے لیئے بھیجا تھا اور فرماتے تھے "جس نے صحابہ کو نہ دیکھا ہو وہ مولوی لطف اللہ کو دیکھ لے"۔ ان کے صاحبزادگان برسوں یہاں رہ کر فیضیاب ہوئے، مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کا ایک واقعہ شروانی صاحب نے نقل کیا ہے کہ قاضی مبارک کا درس ہو رہا تھا، مولوی عبد الحق صاحب آکر بیٹھ گئے۔ سبق بند ہو گیا مگر ان کے اصرار پر پھر شروع کر دیا، بعد ختم درس طلبا سے فرمایا کہ "تمہارے استاد کی تقریر ایسی ہے کہ اعتراض خود بخود دفع ہو جاتے ہیں"۔ مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی شیخ الہندؒ ایک بار دہلی آئے ہوئے تھے، حضرت بسلسلہ اپنے علاج کے وہاں مقیم تھے، شیخ الہندؒ عیادت کو تشریف لائے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے حیدر آباد کا تقرر بعہدۂ مفتی سن کر فرمایا کہ مولانا کی ذات اس عہدہ سے بھی ارفع ہے۔

تیسویں یہ کہ ہر متن میں مشکل اور لغزش کے مقامات پر مخصوص تقریریں قلمبند فرمائی ہیں، جس سے سارا اشکال رفع ہو جاتا ہے، سب تقریروں کا استقصاء[1] نقل کرنا غیر ممکن ہے، چند بطور نمونہ یہاں نقل کرتا ہوں،

(۱) حمد اللہ بحواشی مولوی مفتی عبد اللہ ٹونکی مطبوعہ لاہور کے ص ۲۰ کے حاشیہ پر ہے :-

قوله والتعرض لوقوع جواب سؤال
تقریره ان القول بتعلق الاذعان
بالوقوع کما صرح به المصنف ههنا
ینافی ما افاده سابقاً من تعلقه بامر
مجمل وتوضیح الجواب ان الافادة السابقة
انما کانت من تحقیقات نفسه وهذا
القول مبنی علی مشرب الجمهور
وقد وقع مثله فی مباحث التصورات
ایضاً حیث قال العلماء کان اعتقاداً
لنسبة خبریة فتصدیق وحکم"

(۲) تصریح شرح تشریح الافلاک مطبوعہ مجتبائی دہلی کے ص ۱۱

قوله ویدفعه الخ هذا تتمة الرد لا جوابه
من قبل الاشراقیه والضمیر المنصوب
المتصل یرجع الی عدم حدوث النار
عند القطبین کما یظهر من المراجعة
الی المنهیة لا الی الرد کما ظنه الشارح
حیث ذکر مرجعه الی الرد والی عدم
حدوث النار علی سبیل الترديد
وتقریر المقام ان اللازم من مذهب
المشائیة عدم حدوث النار عند
القطبین وهو باطل اذ نشاهد حدوث
النیازک عند القطبین ایضاً کما نشاهدها
عند المنطقة وذلک یدل علی حدوثها
عندهما ایضاً فاذا ثبت بطلان لازم
مذهب المشائیة ثبت بطلانه ایضاً
فثبت کون النار کرة مستقلة فافهم
تشکر

(۳) مولوی غلام یحییٰ بر میر زاہد رسالہ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنؤ کے ص ۱۳۳

قوله لکان احسن کما لا یخفی حاصل
المنع الاول تسلیم اجتماع تلک
الامور فینا وعدم تسلیم لاتناهیها
والحاصل الثانی تسلیم اللاتناهی و
عدم تسلیم الاجتماع فدفع هذا
البعض لکونه مثبتاً للاتناهی تلک
الامور یلائم الاول ولا یرد علیه
ما اورده المحشی لان فی الاول
تسلیم الاجتماع واما المنع الثانی فلا
یدفع بما ذکر لان التناهی مسلم فیه
والاجتماع لا یثبت بالمذکور لا تدبر
علیه ما اورد هذا" ولعلک تفطنت
بصحة قول المحشی نعم لو تصدی بهذه
العنایة لدفع المنع الاول لکان احسن
وفساد ما قیل ان دفع المنع الاول
بهذه العنایة ایضاً غیر تام بعین
ما ذکره الخ فافهم واستقم

اکتیسویں یہ کہ نابینائی اور معذوری کی حالت میں مجھ کو پڑھایا اور ایسا پڑھایا کہ بینا نہیں پڑھا سکتے ، دوران سبق میں کسی اور کتاب کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ پڑتی

قسم دوم کمالات عامہ از قسم تصحیح کلمات، لطائف و شعر و تاریخ گوئی

حضرت کو صحت الفاظ کا نہایت اہتمام تھا، کبھی غلط الفاظ خود برتنا تو درکنار دوسروں کی زبان سے بھی سننا برداشت نہ تھا، اگر کوئی تکلف والا ہوتا تو اپنی زبان سے اس کو غلط بتائے بغیر صحیح تلفظ کے ساتھ دہرا دیتے جس کو فہیم شخص سمجھ لیتا اور بے تکلف لوگوں سے کھل کر فرما دیتے کہ یہ غلط ہے، صحیح صورت دوسری ہے، اس قسم کی تصحیحات کا استقصار بھی غیر ممکن ہے، مگر اس وقت جتنے الفاظ خیال میں ہیں ان کو لکھتا ہوں :-

۱- کسی چیز کی پختگی کا اظہار نقش کالحجر سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے

ہمارے دل پہ نقش کالحجر ہے تیرا فرمانا

فرماتے کہ یہ استعمال غلط ہے، صحیح "کالنقش فی الحجر" ہے،

۲- عام طور پر ناظم کو اہتمام سے مہتمم بصیغہ اسم فاعل بولا جاتا ہے، فرماتے کہ اہتمام سے اسم فاعل کا صیغہ مہتمِم ہے نہ کہ مہتمَم۔

۳- بڑے بڑے لوگ علاوہ بفتح عین بولتے ہیں، فرماتے کہ صحیح بکسر عین ہے، اور اس کے معنی بتاتے کہ جانوروں پر دو جانب بوجھ لادنے کے بعد جو وزن بیچ میں پشت پر ہوتا ہے اسکو علاوہ کہا جاتا ہے، چنانچہ میں قاموس سے حوالہ دیتا ہوں، والعلاوۃ بالکسر وما وضع بین العدلین ومن کل شئی ما زاد علیہ۔

۴- آفت رسیدہ چیز کو ماؤف لکھا بھی جاتا ہے، ایک بار حضرت کی پسلیوں میں درد ہوا، اور کئی روز رہا، میں وقتاً فوقتاً حاضر ہو کر مزاج پرسی کرتا، ایک بار عشا کے بعد حاضر ہو کر پوچھا تو فرمایا کہ "اب درد نہیں ہے مگر دُکھن ہے"۔ میں نے عرض کیا اتنے عرصہ تک درد ان میں رہا، پسلیاں ماؤف ہو گئیں، برجستہ فرمایا کہ ماؤف غلط ہے۔ موؤف بروزن مقول صحیح ہے اور گردان بھی فرما دی آف یؤوف آفۃ فھو موؤف۔

۵- مشکور بمعنی شکرگزار استعمال ہوتا ہے، فرماتے کہ اس کے معنی اُلٹے ہیں، یعنی مشکور وہ ہے جس کا شکر ادا کیا جائے نہ کہ شاکر، اسی طرح شکر خود مصدر ہے، ی اور ت بڑھا کر شکریہ غلط ہے، کیونکہ ی ت کا اضافہ ان کلمات پر کیا جاتا ہے جو مصدر نہ ہوں اور بطور مصدر انکو استعمال کرنا ہو جیسے فاعلیت وغیرہ اسی طرح تابعدار بھی غلط ہے، کیونکہ بمعنی متبوع کے ہے اور لوگ اس کو تابع کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

۶- عمداً بمعنی قصداً۔ بفتح المیم بولا جاتا ہے، فرماتے کہ صحیح سکون المیم ہے۔

۷- طوالت عام طور پر بولتے ہیں جو غلط ہے صحیح طول ہے۔

لطائف علمیہ ۱- جب کسی کو کوئی غم ہو اور اس میں تخفیف ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ غم غلط ہوا، ایک روز مجھ سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے، میں نے عرض کیا نہیں معلوم فرمایا کہ غم کے اعداد ایک ہزار چالیس ہیں اور غلط کے ایک ہزار انتالیس ہیں، یعنی صرف ایک کی کمی غلط میں ہے

گویا اسی کمی کی طرف اس کلمہ سے اشارہ کیا جاتا ہے، جس کی مقدار ایک کے برابر ہے۔

۲۰۔ ایک بار ذیل کا شعر پڑھا

انچہ برمن می رود گر بر فستر رفتے زغم
می زوندے کافراں در جنۃ الماوی علم

اور مطلب پوچھا، میں خاموش رہا۔ فرمایا کہ آیت لَا یَدْ خلونَ الجنۃ حتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فی سَمِّ الخیاط کی طرف تلمیح ہے۔

شعر گوئی | باوجود اس کے کہ اللہ نے حضرت کو درس تدریس کے لیئے پیدا کیا تھا، شاعری میراث پدری کے طور پر ملی تھی، کسی وقت تفریح طبع کے لئے شعر فرماتے جو اُستادوں کے کلام کے بالمقابل رکھے جا سکتے ہیں، چنانچہ میں نے کلام لطف کے عنوان سے ایک علحدہ رسالہ شائع کیا تھا۔

تاریخ گوئی | برجستہ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا، جس کی مثالیں اشعار میں کلام لطف کے اندر موجود ہیں، بریلی کے قیام کے زمانہ میں ایک نسخہ بیضاوی کا خریدا تھا، اس پر خرید کی یادداشت عربی میں ۹ جملوں میں تحریر فرمائی ہے جس کے ہر جملہ سے تاریخ نکلتی ہے۔

"ھو ھادی الخیرات" (۱۲۶۳) "احمد اللہ الباسط العظیم" (۱۲۶۳) "واصلی علے حبیبہ سید الرسل وعلے آلہ وصحابہ مویدی الدین القویم" (۱۲۶۳) "وبعد فانی قد ملکت بعون اللہ العلیم الھادی" (۱۲۶۳) "ھذا السفر البھی والسامی" (۱۲۶۳) "صنفہ العلامۃ ھو البیضاوی" (۱۲۶۳) "اسطو علیہ شآبیب النعم اللہ المالک الباری" (۱۲۶۳) "ابتعت وانا فی بریلی بالعشیر ونصفھا بعون الواحد الحلیم العلی" (۱۲۶۳) "العبد العاصی المعتصم بحبل اللہ لطف اللہ" (۱۲۶۳)

الغرض کمالات کا کہاں تک احصاء ہو سکتا ہے، یہ شعر صادق ہے

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

آخر میں چند اور خصوصیات حضرت کی تحریر کرتا ہوں جو دائرۂ عنوان سے خارج ہیں لیکن الشیُٔ بالشی یذکر کے ماتحت اس طور پر یہاں لائی جا سکتی ہیں کہ ذات مبارک کے علاوہ ان کا وجود کمتر ہے، پہلی چیز ان میں سے حسن اخلاق اور مزاج کی تواضع ہے، اتنا بڑا صاحب کمال اور ایسے عمدہ اخلاق اور ایسی تواضع کا حامل، حیرت ہوتی ہے، جو شخص بھی ہوتا اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا، اگر راہ چلنے میں کوئی مل جاتا اور باتیں کرنے لگتا تو جب تک خود وہ علحدگی نہ چاہتا وہاں سے نہ ہٹتے، خواہ کتنا ہی ضروری اور جلدی کا کام ہوتا، بڑے چھوٹے ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ سمجھتا کہ اس سے زیادہ کسی پر مہربان نہیں ہیں، اور سب سے زیادہ تعلق اسی کے ساتھ ہے، یہ صفت جبلی اور خلقی تھی، کیونکہ بہ تکلف کوئی ایسے اخلاق نہیں برت سکتا، مسکنت، تواضع اور خاکساری کا یہ عالم تھا کہ تعلی اور کبر کا کہیں دور دور بھی پتہ نہ تھا، باوجود اس قدر بڑا درجہ علم میں رکھتے ہوئے اپنے کو کچھ نہ سمجھتے، اس کا ظہور ہر طریق اور ہر باب سے ہوتا، ہم نے اس سلسلہ میں دیکھا کہ کبھی اگر کسی نے کہا کہ حضرت کا نام سن کر شوق کھینچ لایا تو فرماتے کوئی اور ہو گا، اعلام مشترک ہوتے ہیں، میں تو کچھ بھی نہیں، کبھی "من آنم کہ من دانم" فرماتے، اسی تواضع کا نتیجہ تھا کہ ہمعصر علماء کا ذکر آجاتا تو کلمۂ خیر ہی

فرماتے، کوئی بنا کر کسی کے متعلق ہرگز نہ کہتے، مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ بانی مدرسہ دیوبند علی گڑھ میں رہے تھے وہ تشریف لایا کرتے، اسی طرح مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری مشہور ادیب کا قیام بھی علی گڑھ میں رہا ان سے بہت تعلقات تھے، مولانا قاسم صاحب کے متعلق خود مجھے فرمایا کہ نفس قدسی تھے، مولانا فیض الحسن صاحب کا مرثیہ اور قطعۂ تاریخ لکھا، اسی طرح مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا قطعہ تاریخ لکھا، یہ دونوں کلام لطف میں شامل ہیں

اس سلسلہ کی دوسری چیز وجاہت حسنِ صورت اور نفاستِ لباس ہیں، رنگ صاف، نقشہ عمدہ قد بلند و بالا، جس مجمع میں تشریف فرما ہوتے حسن صورت اور وجاہت کی بنا پر سب سے ممتاز نظر آتے اور نظریں ان ہی کی طرف اٹھتیں، لباس ایسا زیب تن کرتے کہ ان کو پہنے دیکھ کر لوگ وہی کپڑا پسند کرتے جو ان کو پہنے دیکھتے اور بازار میں اس کپڑے کی فروخت بڑھ جاتی،

تیسری چیز سیر چشمی اور فیاضی تھی جو بڑے بڑے رئیسوں کو میسر نہ تھی، پیسے کو پیسہ نہ سمجھتے، جتنا زیادہ خرچ کرتے اتنا ہی زیادہ خوش ہوتے اور کبھی دل تنگ نہ ہوتے کہ اتنا زیادہ خرچ ہوگیا۔

چوتھی ایک اور چیز قابلِ ذکر یہ ہے جو برکت کہی جاسکتی ہے، میں اپنے مکان پر مطالعہ کرتا ہوتا، کوئی مقام حل نہ ہوتا تو اسی وقت حاضر خدمت ہوکر پوچھ لیتا، بعض اوقات ایسا ہوا کہ حاضر ہوا تو دیکھا کہ تکلیف میں ہیں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، خاموشی سے وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرنے لگا، چنانچہ ان کی برکت سے مقام حل ہوگیا۔

الغرض جو ذات قدرت الٰہیہ کا پورا نمونہ تھی اس کی بابت ابوالفتح البستی کا یہ شعر بالکل منطبق ہے۔

لایدرک الواصف المطری خصائصہ	وان یکن سابقا فی کل ما وصفا

(بشکریہ معارف)

مکاشفاتِ کشفی

(بسلسلہ صفحہ ۶)

"کیا کہا ہے" پر ہر مرحل فوقیت حاصل ہے۔ یعنی اگر لعل و گوہر سے بھی "کیا کہا ہے"۔ بہتر ہو لیکن "کیونکر کہا ہے" کی متاع اس کے شامل حال نہیں ہے تو اس "کیا کہا ہے" کے لعل و گوہر خذف پارہ میں بدل کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس "کیا کہا ہے" کو بارۂ ادب کا خطاب قیامت تک نہیں دیا جا سکتا۔

سو بندہ پرور! مجھے اس سے غرض نہیں کہ میرے دوست کشفی صاحب نے "کیا کہا ہے" میں تو کشفی صاحب کے "کیونکر کہا ہے" کو دیکھتا ہوں۔ اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ کیونکہ شاعری فقط اسی کا نام ہے۔ کشفی صاحب شایان مبارکباد ہیں کہ قدرت نے انہیں حسن بیان اور جمال ابلاغ سے اس قدر بہرہ ور کیا ہے کہ میرا سا آدمی بھی جسے تصوف سے کوئی واسطہ نہیں جب ان کی رباعیاں پڑھتا ہے تو داد دینے کے واسطے بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے "لذت تقریر" کے اعجاز کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کشفی صاحب ایک اچھے رباعی گو ہی نہیں۔ ایک اچھے آدمی بھی ہیں۔ اور چونکہ "اچھا آدمی" ہر دور میں اک جنس

(باقی صفحہ ۱۱۰ پر)

غالب اور نواب حامد علی خاں

(از جناب نظیر حسین زیدی ایم۔ اے)

یوں تو غالب کی زندگی میں حزن و یاس کے باوجود ایک ایسا سکون، شیوۂ تسلیم و رضا پایا جاتا تھا کہ جس نے اپنے ماحول پر نہ سہی لیکن بعد میں آنے والے ماحول پر یقیناً اچھا اثر ڈالا۔ مصیبتوں کے باوجود وہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے رہے، پیہم تکالیف کے احساس کے ساتھ ساتھ وہ مسکرا مسکرا کر وقت گزارتے رہے تو کبھی کبھی تو نئے انداز میں، تعلقات خانہ داری کے باعث چاہے ان کی زندگی میں کتنی ہی اُلجھنیں سامنے آئیں لیکن وہ اس کے لئے سینہ سپر رہے اور یہی کہا ؎

کس کے گھر آئیگا سیلابِ فنا میرے بعد

اپنے غموں کو ہنس ہنس کر ٹالنا دوسروں کے غموں کو کم کرنے کی فکر کرنا، یہی وہ فلسفۂ حیات ہے جس نے غالب کو حیاتِ جاوداں بخشی، خود تو نیرنگیٔ قدرت کا تماشا دیکھا کئے، مگر دنیا کے دامِ خیال میں اُلجھنے سے دوسروں کو یہ کہہ کر بچاتے رہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

لیکن غدر کے پر آشوب ہنگام نے ان کے دل و دماغ پر جو اثر کیا قتل و غارت، لوٹ، مار نے جس بیداد تھی نہ فریاد، ان کو جس قدر رُلایا اُس کا اندازہ ذیل کے شعر سے ہوسکتا ہے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غالب کے وہ خطوط اُردو ادب میں شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں اُنہوں نے غدر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس غمِ روزگار میں اپنے غم کو بھول گئے۔ دوسروں کے غم نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے، انہیں شخصیتوں میں ایک قابلِ قدر شخصیت نواب حامد علی خاں کی تھی۔ اگرچہ حضرت بہادر شاہ ظفر کی سلطنت کیا اور حکومت کیا۔ لیکن اس دور میں جس قدر یادگارِ زمانہ شخصیتیں قلعہ میں جمع تھیں وہ بھی اپنے دور میں بسا غنیمت تھیں۔ بلکہ بقول رشید احمد صدیقی "اس دور میں ایسے افراد کا اجتماع ہوگیا تھا جو اس سے قبل اس ممتاز حیثیت سے نہیں ملتا۔"

بہادر شاہ کی درویشانہ طبیعت جو دُنیا کے سیاسی جوڑ توڑ سے پہلے متنفر تھی اپنے گرد ایسے مجمع کو ہی پسند کرتی تھی جو خاموشی اور سکون سے اپنے باقی وقت کو گزار دیں۔ یہ لوگ وفا داری، ہمدردی محبت اور ہمہ گیر اخلاق و کرم کا بے مثل نمونہ تھے۔ ان لوگوں

میں رکھ رکھاؤ، وضع کی پابندی انسانی تعلقات دیسے کرنیکا جذبہ کم از کم موجودہ زمانے کے لوگوں سے ہزار درجہ زیادہ تھا۔

میرے خیال میں یہی وہ چیز تھی جسے غالب نے اپنے خطوط کے آئینہ میں پیش کیا اور اسی چیز کے مٹنے نے انھیں اضطرابِ مسلسل میں رکھا۔

"یہاں کا یہ حال ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علی خان، نواب حامد علی خان حکیم حسن اللہ خاں۔ سو ان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں"۔

اردوئے معلی ص ۲۷۸ بنام شیو نرائن۔

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہوگئے وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کے مکان میں مع منتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم نہیں لا۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا نہیں ہے"۔

مندرجہ ذیل سطور میں نواب حامد علی خاں کے متعلق ہم کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

نواب صاحب 'پرست' دریائی پت کے قریب سادات کی بستی، کے رہنے والے تھے یہ ایک پرانی بستی ہے سلطان محمود کے زمانے میں اس بستی کے مورث اعلیٰ ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے۔ پہلے یہ خاندان ریاست پٹیالہ میں رہا۔ اس کے بعد کچھ نسلیں مظفر نگر کے علاقہ میں منتقل ہوگئیں۔ اس ضلع میں سادات بارہہ کی بنیاد پڑی۔

اس کے بعد دو شاخیں ہوئیں۔ ایک شاخ موضع سرسی ضلع مراد آباد میں آباد ہوئی۔ دوسری شاخ 'پرست' میں۔ تاریخی قرائن کے اعتبار سے یہ بستی ۶۰۰ سال کی آباد شدہ ہے

بہرحال نواب حامد علی خاں یہیں کے باشندے اور نواب فضل علی خاں وزیر اودھ کے بھانجے اور داماد تھے انھیں کے باعث حامد علی خاں کو یہ عروج حاصل ہوا ضمنی طور پر یہ واقعہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے کہ نواب فضل علی خاں کس طرح وزیر ہوئے؟ ان کے والد غازی الدین حیدر کے عہد میں نگہبان تھے اور یہ عہدہ اس لئے ملا تھا کہ وہ سید تھے بادشاہ کی سواری جب نکلتی تو یہ مہاوت کی طرف پشت کرکے بادشاہ کے سامنے بیٹھتے تھے تاکہ بے ادبی نہ ہو کہ مہاوت کی پیٹھ بادشاہ کی طرف ہو لہٰذا سید کو بادشاہ و مہاوت کے درمیان بطور نگہبان بٹھایا جاتا تھا' نواب غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد نواب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور ان کی والدہ مغلانی اور استانی بنی۔ نواب نصیر الدین حیدر اپنی والدہ کا بہت ادب کرتے تھے' ہر روز صبح کے وقت سلام کو آتے اسی درمیان میں آغا میر برطرف ہوئے' ایک دن جو نواب سلام کو حاضر ہوئے تو والدہ نے پریشان و مضطرب پایا۔ جب انھوں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ قلمدان وزارت کس کے سپرد کروں۔ مشورہ دیجئے' والدہ نے فضل علی کی سفارش کی۔ نواب نے کہا وہ تو اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے والدہ نے کہا وہ کائستھ جو نائب وزیر ہے اس عرصہ میں منتظم اعلیٰ بھی رہے اور فضل علی کو امور سلطنت کی تعلیم بھی دے۔ اس طرح ان کی تعلیم و تربیت محل ہی میں ہوئی اور ۱۸۲۸ء میں وہ نائب السلطنت بن گئے۔ ان کی بہن کی شادی 'پرست' میں ہوئی تھی جن کے

بطن سے حامد علی خاں پیدا ہوئے تھے اس وقت حامد علی خاں کے والد اپنے وطن میں کھیتی کا کام کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر کا کھانا لینے کے لئے حامد علی کو گھر بھیجا گیا۔ یہ دیر میں پہنچے تو والد سخت ناراض ہوئے اور یہ غصہ میں آکر پرست سے چلدیئے اور لکھنؤ کا رخ کیا۔ مصیبت جھیلتے خاک چھانتے لکھنؤ پہنچے۔ غربت کی گرد منہ پر پڑی ہوئی، پھٹے کپڑے برا حال۔ ماموں تک رسائی ہو تو کیونکر ہو۔ ایک دن نفضل علی کی سواری گذری حامد علی نے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ چوبدار کو اشارہ ہوا وہ حامد علی کے قریب گیا پوچھا تو معلوم ہوا کہ پرست کے رشتے والے ہیں۔ چوبدار صاحب نے جاکر عرض کی نواب صاحب نے اپنے بھانجے کو بڑی مشکل سے پہچانا حکم دیا کہ محل میں پہنچا دیا جائے۔

ایک دن دوران گفتگو میں نواب صاحب نے کہا میں پرست والوں کو ٹھیک کر دوں گا۔ بستی کے بہت سے آدمی لکھنؤ میں گھبرا گئے کہ اب بلا ہمارے سر آئے گی مگر یہ گھبراہٹ بے بنیاد ثابت ہوئی ایک روز ان سب کی دعوت نواب صاحب کی طرف سے کی گئی۔ دعوت کے بعد نواب نے کہا آپ سب میرے عزیز ہیں جو تکلیف آپ کو ہو آپ سب بلا تکلف کہدیں۔ میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اہل وطن نے جب نواب صاحب کا یہ اخلاق دیکھا تو پاؤں پر گر پڑے۔

۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۱ء تک نواب حامد علی خاں کی تعلیم و تربیت ماموں کی سرپرستی میں ہوئی ماموں نے اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی جس کا نام حاجی بیگم تھا۔

۱۸۳۱ء میں نواب فضل علی نے انتقال کیا کسی ظریف نے مصرعہ تاریخ کہا "وحت وحت بری" حاجی بیگم دختر نواب فضل علی، کو باپ کے انتقال کے بعد ترکہ میں نو لاکھ روپیہ ملا بعد میں یہ روپیہ خزانہ شاہی میں جمع کرا دیا۔ جس کا سود ساڑھے چار ہزار روپے ملتا تھا۔

خسر کے انتقال کے بعد نواب حامد علی خاں نے دہلی میں آکر قیام کیا۔

۱۸۳۲ء (مطابق ۱۲۴۸ھ) میں نواب حامد علی خاں نے اپنے وطن میں عزا خانہ (امام باڑہ) تعمیر کیا۔ اس کی تعمیر کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ اب تک یہ عمارت بانی عمارت کے ذوق تعمیر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو تفصیل سے معلوم نہ ہو سکا ہے کہ مرزا غالب سے مراسم کس طرح قائم ہوئے لیکن یہ ضرور ہے کہ مراسم رفتہ رفتہ گہرے ہوتے گئے جس کا اثر مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے مرزا غالب کی شاعری کا یہ دور فارسی شاعری کا تھا اسی لئے امام باڑہ مذکور کے لئے بھی قطعہ تاریخ فارسی میں کہا ہے۔

گلی ز گلبن حیدر شگفت در عالم
بباغ آل نبی حامد علی لسنجا
بابر فیض دل سنگ را نماید آب
بہ لطف بلبل تصویر را کند گویا
بنا نمود چون قصر پی عزای حسین
ز مہر رواق بلند است نالۂ زہرا
چون آہ داشت ستونش وگرخم محراب
دید بیاد ہلال مہ محرم را
برای سال بنائش بگریہ ہاتف گفت
مکان ماتم آل عبا متین بنا (۱۲۴۸ھ)

یہی وہ دور تھا جب مرزا کلکتہ سے واپس آچکے تھے اور مقدمہ پنشن کا فیصلہ ان کے خلاف ہوگیا تھا مرزا کی توجہ زیادہ تر فارسی ادب کی طرف منعطف ہوگئی تھی۔ اور اب وہ تمام چیزوں سے مایوس ہوکر گھر میں بیٹھ رہے تھے۔

چند سال کے بعد نواب صاحب نے کشمیری دروازے کے باہر مسجد کی تعمیر کی اور مرزا غالب نے اس مسجد کی بھی تاریخ تعمیر کہی۔

اعتماد الدولہ کز افراط جود
ہست در پیش کفش قلزم غدیر
دیدہ ورحامد علی کز اوصفا
بنید اسرار ازل را در ضمیر
ساخت در دہلی ہمایوں مسجدے
تا شود طاعت گہہ برنا و پیر
غالب آں طوبی نشیمن عندلیب
زد باند از سخن سنجی صفیر
شد نظیر کعبہ در عالم پذیر
سال تعمیرش بود کعبہ نظیر

سنہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء)

مرزا صاحب کبھی کبھی اس مسجد میں جاتے تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"ہر صبح کو حامد علی کی مسجد میں قرآن جاکر سنتا ہوں شب کو مسجد میں تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آجاتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں"۔

(غالب نمبر علیگڈھ میگزین)

اعتماد الدولہ نواب فضل علی خان کو محبت دہلی سے تھی اس کا نتیجہ عربک کالج کی شکل میں آج تک موجود ہے اعتماد الدولہ نے جب روپیہ سرکار انگریزی میں داخل کیا تو وقف نامہ میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ الفاظ بھی تھے اگر گورنمنٹ اس روپے کے صحیح مصرف میں عدم توجہی کا اظہار کرے تو میرے بھانجے اور داماد نواب حامد علی خاں گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کرتے رہیں گے۔

سنا ہے حامد علی تقریباً نو مہینے بہادر شاہ کے وزیر بھی رہے، مگر اس امر کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ بہر حال غدر کا ایک واقعہ یوں مشہور ہے کہ نواب حامد علی نے پہلے جنرل چھاونی کی بیٹی اور صاحب انگریز کی بیوی کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا باغی فوج یہ سنکر دوڑی آئی۔ گھر لوٹ لیا، انھیں جان سے مارنا چاہتی تھی کہ مرزا ابو بکر شہزادہ جا پہنچے۔ اس طرح ان کی جان بچی۔ اور انھیں کہیں اور بھیجدیا۔

یہ اخبار ہر روزہ دربار شاہی اپنے بھتیجے فرزند علی کے ہاتھ مولوی رجب علی ارسطو جاہ مہتمم اخبار سرکار کے پاس بھیجتے تھے۔ تاکہ ہڈسن صاحب جنرل افواج کو اطلاعات بہم پہنچتی رہیں اور اپنے وطن قدیم سے غلہ ورسد حسب ضرورت معاصرین سرکار کو بھیجا کرتے تھے جب فوج سرکار شہر میں داخل ہوئی، ایک روز پیشتر شہر سے نکل کر برف خانہ میں جا ٹھہرے بعد ازاں سرکار انگریزی ہڈسن صاحب کے بلانے پر ان کے پاس پہنچے، ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپے پیش کئے اور ان سے اجازت لے کر اپنے عیال کو پرست روانہ

کیا، وہ اشخاص جو باغیوں کے شریک تھے ان کی اجازت سے قافلے میں شریک ہوتے جاتے تھے۔ سینکڑوں آدمیوں کو زاد راہ وسفر خرچ وسواری سے مدد کی یہ قافلہ دس ہزار کے قریب پہنچ گیا۔ ان کے عیال پرست میں رہے باقی لوگ متفرق ہوگئے۔ تین چار دن بعد مولوی رجب علی ارسطو جاہ (ساکن جگراں ضلع لدھیانہ)، کے ساتھ نواب صاحب تشریف لائے، اور مولوی صاحب واپس کرنال چلے گئے۔

۱۹ صفر ۴، ۱۲ھ (۱۸۵۷ء) قبل از نماز صبح رچرڈ کلکٹر کرنال مع دو سوار کے آئے۔ نواب صاحب کا گھر گھیر لیا۔ تقریباً نو لاکھ کا سب مال واسباب لوٹ لیا یہاں تک کہ سروں پر چادر بھی نہ رہی چنانچہ ایک باغی شخص کے پاس سے جو اسی لوٹ میں شریک تھا پانی پت میں ایک مالا مروارید ایک گھنٹہ نکلا جس کی قیمت کا اندازہ ۸۰ ہزار روپے ہوا۔

اس کے بعد حامد علی خان، میر عباس میرزا، محمد دلبر مرزا اور ۲۲ ملازمین کو قید کر کے پیادہ کرنال لے گئے وہاں سے شکرم پر سوار کر کے دہلی بھیجدیا۔ باقی عورات کو زندان وطن میں رہنے دیا۔ ہڈسن صاحب جو نواب حامد علی خان کے مددگار تھے وہ حضرت گنج لکھنؤ میں مارے گئے۔ لہٰذا یہ وسیلہ ظاہری بھی ختم ہوگیا۔ غرض غدر کے بعد ۱۴ ماہ تک حوالات میں رہے فروری ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔

مندرجہ ذیل سطور تیصر التواریخ کی ہیں، جن سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حامد علی خان انگریزوں سے مل گئے، دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کلکٹر کرنال نے ان کو قید کر کے دہلی واپس بھیجدیا۔ دونوں چیزوں میں تضاد ہے۔

اگر باغیوں میں شمار تھا تو حامد علی خاں نے اس قدر روپیہ انگریزوں کو کیوں دیا۔ بہ اطمینان تمام وطن کیسے آگئے انگریزوں کے ساتھ تھے تو تہہ کیوں ہوئے اور اُن کی تمام جائیداد سکنی جو کاٹھ کے پل سے لے کر ڈفرن برج تک تھی وہ سب کیوں ضبط ہوگئی؟

یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب کی رہائی کے لئے مولوی رجب علی صاحب ارسطو جاہ اور خلیفہ محمد حسن صاحب نے بہت کوششیں کیں اور انہی کے باعث وہ رہا ہوئے۔

بستی کے بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ امام باڑہ کا تمام قیمتی سامان فانوس وغیرہ مولوی رجب علی صاحب نے پوری کوششوں سے واپس لیا۔ اور ان کی رہائی کے بعد خط لکھا کہ آپ کا یہ سامان میرے پاس امانتاً موجود ہے چونکہ حامد علی خاں ان کے ممنون تھے لہٰذا انہیں بہ خوشی اجازت دی کہ آپ یہ سامان اپنے وطن کے امام باڑہ میں رکھ لیں۔ اس طرح یہ تمام سامان، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ تک جگراؤں رہا۔

غرض ان کا آخری وقت بہت تکلیفوں سے گزرا۔ غالب نے اپنے ایک خط مورخہ ۸ جولائی ۱۸۵۹ء میں لکھا ہے یہ خط معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر معروف بہ حیدر مرزا کے نام تھا۔

"صاحب: قلی خاں نے غلط لکھا ہے۔ نہ حسن علی خاں متعہد نہ حامد علی خاں نہ حکیم احسن اللہ خاں، حکم آخر تینوں کے واسطے نہیں ملا، حکیم احسن اللہ کے مکانات پر انکو قبضہ

مل گیا۔ زنانہ مکان جو عقب حمام ہے اس میں ایک انگریز اترا ہوا ہے۔ بنیا ان کو ۵۰ روپے کرایہ دیتا ہے۔ دیبی سنگھ سالک رام کو ان کو مکانات مل گئے۔ ایسا بھی سنا ہے کہ ان کے وثیقے بچ گئے۔ اب وہ حامد علی خاں کو قطب الدین سوداگر کی کوٹھی سے اٹھا کر اپنے مکان میں لے گئے ہیں"

نواب حامد علی خاں کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی صرف اولاد دختری تھی جس کی شادی انھوں نے اپنے بھانجے اسد علی خاں تپش سے کی تھی (جو ایک مشہور شاعر تھے اور جن کے نوحے اپنی پاکیزگی زبان اور رقت آمیزی کے لحاظ سے آج تک مشہور ہیں)

نواب صاحب اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے بامروت آدمی تھے جھک کر ملنا ان کی عادت میں داخل تھا۔ جب بھی وہ کبھی پرست اپنے وطن میں آتے تو اس کی حد میں داخل ہوتے ہی ہاتھی سے اتر پڑتے اور بستی میں پیدل داخل ہوتے۔ لوگوں نے اسکی وجہ دریافت کی تو کہا مجھے یہ دیکھکر شرم آتی ہے کہ میں ہاتھی پر سوار رہوں جبکہ میرے اہل وطن کے پاس یہ سواری نہیں ہے۔

ایک اور واقعہ ان کے متعلق سنا گیا ہے کہ انھوں نے دہلی میں کوئی تقریب کی۔ اس کے بعد وطن آئے اور اہل وطن کی دعوت بھی اسی تقریب کے سلسلے میں کی۔ کیا چھوٹے کیا بڑے سب شریک ہوئے لیکن ایک سید صاحب جو نواب صاحب سے خفا تھے وہ شریک نہ ہوئے نواب صاحب نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑائے بڑی مشکل سے پتہ چلا لوگوں نے لاکھ کوشش کی کہ شریک ہو جائیں لیکن وہ نہ آئے آخر نواب صاحب کو خود جانا پڑا اور منا کر لائے اور ان کو بھی شریک طعام کیا۔

نواب صاحب کا انتقال دہلی میں ہوا۔ بیرون شہر ... باغ میں دفن ہوئے۔ یہ حصہ اب دہلی کے ریلوے اسٹیشن میں شامل ہو گیا ہے!

حوالہ جات:۔ غالب از مہودرہ باہرہ غیر مطبوعہ نوشتہ ۱۳۰۱ھ اردوئے معلی، قیصر التواریخ۔

مکاشفاتِ کشفی

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۰۰)

نایاب اور متاع متعدد رہا ہے اس لئے ان کا وجود بازار جماعت کا ایک ایسا زبردست اثاثہ ہے کہ اگر ہم اس کی قدر نہ کریں تو اپنے نفس کی شرافت کے واسطے کوئی دلیل ہی نہ مل سکے گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

جزائر فلپائن میں

میرا قیام

(از جناب افتخار حسین صاحب ایم۔ ایس۔ سی)

اب سے ۶ ماہ قبل مجھے معلوم ہوا کہ میں ایڈوانسڈ مینجمنٹ پروگرام میں شرکت کی غرض سے فلپائن بھیجا جا رہا ہوں اسی وقت سے میں نہایت بے چینی کے ساتھ وہاں جانے کے دن کا منتظر رہنے لگا۔ یہ پروگرام باگویو کے مقام پر ہارورڈ یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو ماہ تک ہونے والا تھا۔ اس وقت تک مجھے چاٹگانگ سے آگے مشرق کی طرف جانے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ جس ملک میں مجھکو جانا ہے وہاں کے متعلق جسقدر معلومات حاصل ہوسکیں، کراچی چھوڑنے سے قبل فراہم کرلوں چنانچہ کچھ معلومات مجھے سرکاری ذرائع سے حاصل ہوگئیں۔

فلپائن ایک ایسا ملک ہے جس میں ۷۱۰۰ جزیرے شامل ہیں اس کو مشرق کا گوہر تابدار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرے خط استوا کے نزدیک اس سے شمال کی جانب واقع ہیں اور ایشیا کے جنوبی کنارے سے کچھ فاصلہ پر تقریباً ۱۰۰۰ میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جزیروں کا پھیلاؤ شمالاً جنوباً ۱۱۵۲ میل ہے شمال میں فارموسا سے لے کر جنوب میں بورنیو تک ان کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ یہ فاصلہ مغربی پاکستان کے شمالاً جنوباً فاصلہ سے کچھ ہی زیادہ ہے خشکی کا رقبہ ایک لاکھ ۱۵ ہزار، سو اٹھاون مربع میل ہے۔ جن میں ۷۷۰۰۰ مربع میل رقبہ میں جھیلیں واقع ہیں۔ اس کا کل رقبہ مشرقی پاکستان کے دوگنے رقبہ سے کسی قدر زیادہ ہے۔ اس کے گیارہ بڑے بڑے جزیروں کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل ہے۔ ان جزیروں میں سے دو بڑے جزیرے بہت مشہور ہیں ایک لوزان جو شمال میں واقع ہے اور دوسرا منڈانن جو جنوب میں ہے مجھے جن مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا وہ سب لوزان میں واقع ہیں۔

جاپان کو چھوڑ کر دیگر مشرقی ممالک کی نسبت میرا گمان یہ تھا کہ وہ پاکستان سے کم ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے جب ہمارا ہوائی جہاز ۹ بجے رات کو منیلا کے اوپر پرواز کر رہا تھا تو یہ دیکھ کر میرے دل میں سرور و استعجاب کی لہر دوڑ گئی کہ منیلا کے وسیع رقبہ پر مختلف رنگوں کی بجلیاں روشنیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ رات کو ہوائی جہاز سے منیلا کا نظارہ بہت ہی پُر لطف ہوتا ہے۔ منیلا فلپائن کا دار السلطنت ہے۔ اس کا رقبہ کراچی سے کہیں زیادہ ہے اگرچہ اس کی آبادی صرف ۱۲ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کی سڑکیں عمدہ اور باترتیب ہیں۔ عمارتیں بلند اور پارک

وسیع ہیں۔ شہر بہت صاف ستھرا ہے۔ مجھے یہاں جون کے مہینے میں چار یوم قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔

اس ملک کے سکہ کو "پیسو" کہتے ہیں۔ سرکاری شرح کے مطابق ۴ پیسو ایک امریکن ڈالر کے برابر ہوتا ہے مگر پیسو کی قیمت خرید ۵۰ امریکن سینٹ کے قریب ہے۔ میرے نزدیک پیسو کی واقعی قوت خرید ایک پاکستانی روپیہ کے برابر ہوگی۔ یہاں ہر چیز پاکستان سے زیادہ گراں ہے اور محنت کش طبقہ کی اُجرت بھی زیادہ ہے۔ مثلاً دُھلائی ہی کو لیجئے۔ میں نے سنگا پور میں ایک پاجامہ ۸ روپے میں خریدا تھا۔ اس کو منیلا میں معمولی ڈلیوری (ارجنٹ ڈلیوری نہیں) کے لئے دُھلائی کو دیا تو ۴ روپے کے مساوی اُجرت دینی پڑی۔ ایک معمولی کلرک کی ماہواری تنخواہ ۲۰۰ پیسو ہوتی ہے جو پاکستانی سکے میں ۵۰۰ روپے کے مساوی ہے۔ مگر اس تنخواہ میں بھی فلپائن کا کلرک اس فراغت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرسکتا جو اسی حیثیت کے کلرک کو پاکستان میں حاصل ہے۔

منیلا کے دوران قیام میں مجھ کو مضافات میں جانے کا بھی موقعہ ملا۔ صوبہ باٹان میں سب سے زیادہ خوبصورت جھیل کی سیر کرنے کا اتفاق ہوا اس جھیل کو "ٹال لیک" کہتے ہیں۔ یہ ایک وسیع جھیل ہے اور اس کے وسط میں ایک جزیرہ ہے جو آتش فشاں پہاڑ کی چٹانوں سے بنا ہے۔ اس مقام کو دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے آتے ہیں۔

اس ملک کے دیہات میں سفر کرتے ہوئے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں وطن ہی میں سفر کر رہا ہوں کیونکہ گرد و پیش کے مناظر بہت کچھ مشرقی پاکستان کے دیہاتی مناظر سے ملتے جلتے ہیں۔ درخت اور پودے زیادہ تر وہی ہیں جو پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس ملک میں سڑکیں مقابلتاً بہت عمدہ ہیں۔ کاشت کے طریقے بھی عموماً وہی ہیں جو پاکستان میں رائج ہیں وہی قدیم طرز کے ہل استعمال ہوتے ہیں اور ان میں بھینسے جوتے جاتے ہیں۔

منیلا میں چار یوم قیام کرنے کے بعد میں باگویو کے لئے روانہ ہوا۔ سفر کا کچھ حصہ سڑک کے ذریعہ طے کرنا پڑا اور کچھ ریل سے۔ باگویو ایک پہاڑی مقام ہے جو پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ریل کا سفر نہایت آرام دہ تھا اور سڑک کا سفر نہایت فرحت بخش کیونکہ پہاڑیاں چنار کے سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے منظر نہایت خوب صورت اور دل آویز ہو گیا تھا۔

میں نے باگویو میں دو مہینے تک قیام کیا۔ اس عرصہ میں زیادہ تر بارش ہوتی رہی۔ صبح کو دھوپ خوش گوار ہوتی تھی اور تیسرے پہر سے بارش ہونے لگتی تھی جس کا سلسلہ شام تک جاری رہتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں معمولاً اسی طرح کا موسم رہتا ہے۔ پروگرام میں شرکت کرنے والے افراد دھوپ کا لطف نہیں اُٹھا سکے کیونکہ تعلیمی مباحث کے لئے صبح کا وقت رکھا گیا تھا۔ اور شام کو بارش کی وجہ سے باہر نکلنا محال تھا۔ پروگرام میں حصہ لینے والوں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ ہارورڈ یونیورسٹی نے جس کے سپرد پروگرام کا اہتمام تھا موسم کی منصوبہ بندی اس طرح کی تھی کہ پروگرام میں شریک ہونے والے

افراد کو باہر نکلنے کا موقعہ نہ ملے تاکہ وہ مطالعہ میں مشغول رہیں۔

اس موسم میں کئی مرتبہ طوفان باد بھی آئے جس کی وجہ سے مسلسل کئی کئی دن تک بارش ہوتی رہی۔ ہر طوفان کے لیئے فلپائن کے محکمہ موسمیات نے زنانہ نوعیت کے نام مخصوص کر رکھے ہیں مثلاً الائس، بیٹی وغیرہ۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسے نام تجویز کرنے کی کیا وجہ ہے۔ کیونکہ میرے ذہن میں ہوائی طوفان اور فلپائن کی صنفِ نازک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں آتی۔ ممکن ہے فلپائن کے شادی شدہ مرد کوئی مشترک خصوصیت بتا سکیں۔

فلپائن کے متعلق ایک سرکاری کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ چاول کے بعد مچھلی اہل فلپائن کی مخصوص غذا ہے۔ مگر باگویو کے ہوٹل میں دو ماہ تک قیام کے دوران مجھے تجربہ ہوا کہ چاول کے بعد مخصوص غذا سور کا گوشت ہے۔ انکے اکثر کھانوں میں سور کا گوشت شامل ہوتا تھا۔ ہوٹل کے ابتدائی قیام کے دوران میں میں نے ایک مرتبہ چوزے کا شوربہ طلب کیا جو کھانوں کی فہرست میں درج تھا۔ جب شوربہ آیا تو مجھے اسمیں کچھ سُرخ سُرخ مہین ٹکڑے نظر آئے۔ دریافت کیا تو ملازم نے مجھے بتایا کہ یہ سور کا گوشت تھا۔ دوسری مرتبہ میں نے گائے کا بھنا ہوا گوشت طلب کیا تو اُس کے ساتھ ترکاری میں وہی سُرخ ذرّات موجود تھے۔ مجھے پھر یہی بتایا گیا کہ لذیذ بنانے کے لیئے سور کا گوشت شامل کیا گیا تھا۔ اس وقت سے میں زیادہ تر سبز ترکاریوں پر گزارہ کرنے لگا۔ اور ہوٹل والوں سے کہہ کر ایسا انتظام کر لیا کہ میرے کھانے میں سور کا گوشت سامنے نہ لایا جائے۔ ہوٹل والوں نے میرے ساتھ اس بارے میں مکمل تعاون کیا اور میرے لئے مخصوص انتظام کر دیا۔

باگویو کے قیام کے دوران میں نے ہفتہ کی آخری تعطیلات میں بعض دوسرے مقامات بھی دیکھے۔ ان میں سے خاص اہمیت امبکلاؤ کے بند اور بجلی گھر کو حاصل ہے۔ بند تو ایسا ہی ہے جیسے دنیا میں دوسرے مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر بجلی گھر مکمل طور پر زمین دوز ہے۔ وہاں جانے کے واسطے جو بس ہم نے کرایہ پر لی تھی اس کو بجلی گھر تک پہونچنے کے لیئے ایک لمبی سرنگ سے گزرنا پڑا۔ یہ انجینیری کا بڑا کارنامہ ہے جس کی تعمیر میں امریکی امداد اور ملکی وغیر ملکی انجنیئروں کا اہم حصہ ہے۔ باگویو کو واپس آتے ہوئے ایک ایسا ہی دوسرا بجلی گھر دیکھنے کا موقع ملا جو زیر تعمیر تھا۔ میرا ارادہ باگویو کے قریب سونے کی کانیں دیکھنے کا بھی تھا لیکن انکو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے نوادر اور زیورات بھی باگویو کی مخصوص صنعت ہیں۔ میں کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے ان نوادر کے صرف دو ایک نمونے ہی لا سکا۔

فلپائن کے زمانۂ قیام میں میں نے متعدد ایسی باتیں معلوم کیں جو فلپائن اور پاکستان میں مشترک ہیں۔ دونوں ملکوں میں دفتری زبان انگریزی ہے، دونوں کی معیشت کو زرمبادلہ کی کمی کی وجہ سے نقصان پہونچ رہا ہے، کئی کمپنیاں تیل کے ذخیروں کی تلاش میں سرگرم ہیں۔ دونوں کی اقتصادیات میں غالب حصہ زراعت کا ہے۔ دونوں کو امریکی امداد کا سہارا مل رہا ہے۔ دونوں میں نظامِ حکومت جمہوری ہے۔

اور دونوں مغربی جمہوریتوں سے رشتہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ دونوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی نصیب ہوئی۔ فلپائن یکم جولائی ۱۹۴۶ء کو آزاد ہوا اور پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو۔ دونوں نے پانچ سالہ منصوبے تیار کئے ہیں۔ دونوں ملکوں میں تیزی کے ساتھ صنعتی کارخانے قائم ہو رہے ہیں اور تعمیر کا کام دونوں ممالک میں تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ تیز باشندوں کی مہمان نوازی کا طریقہ بھی وہی روائتی مشرقی خاطر و مدارات کا طریقہ ہے۔

فلپائن تعلیم کے لحاظ سے پاکستان سے کہیں آگے ہے یہاں کی آبادی صرف ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور پاکستان کی ۸ کروڑ چالیس لاکھ۔ لیکن خواندہ اشخاص کی تعداد اس ملک میں ۶۰ فی صدی ہے جبکہ پاکستان میں صرف ۱۵ اور ۲۰ فی صدی کے درمیان ہے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء اور ۵۶-۱۹۵۵ء یعنی دو سال کے عرصہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مدرسوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں جن پر ۵ کروڑ روپیہ کے مساوی رقم صرف ہوئی تھی جبکہ کل بجٹ دو ارب ۳۰ کروڑ کے قریب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین اس امر سے باخبر ہوں گے کہ ان اعداد کے مقابلہ میں پاکستان کے اعداد و شمار کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

جو اصحاب فلپائن سے تجارتی تعلقات پیدا کرنے میں دلچسپی لیتے ہوں ان کی اطلاع کے لئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فلپائن سے برآمدی اشیا میں۔ خاص بہت تانبہ، شکر لکڑی کے لٹھے، عمارتی لکڑی، ناریل کے تیل وغیرہ کو حاصل ہے اور درآمد کی خاص اشیا میں مشینیں، کپڑا، پٹرول کی چیزیں، دھاتیں اور حمل و نقل کے ذرائع کا سامان شامل ہیں۔ برآمدی تجارت زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ، جاپان، انڈونیشیا اور جرمنی سے ہے۔ ہمارا ملک فلپائن کے ساتھ کوئی قابل ذکر کاروباری تعلقات نہیں رکھتا۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ پاکستان ریلوے اس ملک سے کچھ لکڑی کے سلیپر خرید کر رہی ہے۔

فلپائن کے باشندوں اور وہاں کی حکومت کا یہ اقدام قابل تحسین ہے کہ فلپائن کو جاپانی قبضہ اور امریکی فوج کے دوبارہ قبضہ کے دوران میں جو عظیم نقصان پہونچا تھا اس کی تلافی مکمل طور پر کرلی گئی ہے۔ مگر باشندوں کی یاد سے جاپانی قبضہ کے دوران کئے ہوئے مظالم ابھی تک محو نہیں ہوئے ہیں اور جب اس بارے میں ان سے گفتگو آجاتی ہے تو ان کی شدتِ احساس عیاں ہوجاتی ہے۔

ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مقابلہ میں اہل فلپائن پاکستان اور پاکستانیوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے یہی بات دوسرے غیر ممالک میں بھی صادق آتی ہے۔ اس کا ایک واضح اور اہم سبب جو مجھکو معلوم ہوا یہ ہے کہ فلپائن، سنگاپور اور ہانگ کانگ میں ہندوستانی باشندے تجارت کے سلسلہ سے قیام پذیر ہیں۔ منیلا میں کئی اہم اسٹورز ایسے ہیں جو ہندوستانیوں کی ملکیت ہیں اور خود باگویو جیسے چھوٹے مقام پر تین اہم اسٹورز کے مالک ہندوستانی ہیں۔ تقریباً تمام ہندوستانی اسٹورز کے مالک سندھی ہندو ہیں جو ہندوستان کو نقل مکانی کرگئے ہیں۔ باگویو میں مقیم ہندوستانی باشندے تعلیمی

کورس میں حصّہ لینے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے ساتھ دوستانہ مراسم کے ساتھ پیش آتے تھے اور اکثر ان کو ہندوستانی کھانوں کے لیئے ضیافت پر مدعو کرتے تھے۔ ہم ایسی ضیافتوں کے منتظر رہا کرتے تھے اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

اہل فلپائن بہت محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں مغربی طرز کی پوشاک پہنتے ہیں بہت متواضع ہوتے ہیں اور عام طور پر صاف ستھرے، میل جول رکھنے والے اور خوش مزاج ہیں۔ وہ رقص و سرود کے شوقین ہیں اور چاچا اور بوگی طرز کے عام پسند ناچ میں تقریباً ہر شخص مہارت رکھتا ہے۔ میں نے ان کو دوسروں کی امداد پر بھی آمادہ پایا۔ مجھے لائنز کلب کے سالانہ کنونشن میں شرکت کا موقع ملا جس میں ملک فلپائن کے ۵۳ لائنز کلبس کے نمائندوں نے شرکت کی۔ وہاں کثیر اجتماع کو دیکھ کر یہ واضح ہوتا تھا کہ یہ لوگ جماعتی امداد کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

اہل فلپائن کا زیادہ حصہ انگریزی بولتا ہے اور جن لوگوں سے میرا سابقہ رہا وہ انگریزی خوب رواں بول لیتے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے وہاں کی مقامی زبان جس کو ٹیگا لاگ کہتے ہیں سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ مجھے اس زبان کے صرف دو الفاظ یاد ہیں ایک 'مہوبے' جس کا مفہوم خوش آمدید یا مبارکباد ہے اور دوسرا 'سلامت' جس کا مفہوم ہے "میں شکر گزار ہوں"۔

آخر میں یہ کہنا میرے لیۓ لازم ہے کہ اہل فلپائن کی خاطر و مدارات ہمیشہ میرے دل پر نقش کالحجر بن کر رہے گی اور وہ پر جوش 'مہوبے' بھی جس کے ساتھ وہ میرے پاکستانی دوستوں کا اور میرا خیر مقدم کرتے تھے۔ میں بھی اپنے فلپائنی دوستوں کو تہِ دل سے سلامت' کہتا ہوں[۵]

خواجۂ افلاک

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دِل زندہ و پُرسوز و طربناک

آزاد کی دَولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مُروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

(علامہ اقبال)

---

۵ انگریزی سے ترجمہ کیا گیا (ایڈیٹر)

زندگی کی گراں باریاں

(بسلسلہ گزشتہ)

(ازحا نصیرالدین)

علمی حالات حیدرآباد کے تاریخی حالات۔ معاشرت رسم و رواج وغیرہ کے بعد اب میں مختصراً علمی حالات کا تذکرہ کرتا ہوں۔ علمی حل چل اور تعلیمی سہولتیں اس زمانہ میں نایاب تھیں علم کی گرم بازاری مفقود تھی نہ تو اس قدر مدرسے تھے اور نہ طلباء کی کثرت ہوتی تھی نہ تو اخبارات اور رسالے تھے اور نہ انجمنیں ایک جمود تھا جہالت کی تاریکی تھی جو حیدرآباد کی فضا پر چھائی ہوئی تھی کہیں کبھی افق پر علم کی روشنی کی کوئی کرن نظر آجاتی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند عنوانات کے تحت اس وقت کی علمی حالت کا جائزہ لیا جائے۔

مدرسے حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج نظام کالج تھا اور دوسرا کالج دارالعلوم تھا جہاں مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی تھی ان دونوں سرکاری مدرسوں کے علاوہ مدرسہ نظامیہ غیر سرکاری مدرسہ تھا۔ یہاں دینیات کی تعلیم ہوتی تھی چند سرکاری ہائی اسکول سٹی ہائی اسکول۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول اور مدرسہ عالیہ اور دو ایک امدادی اسکول تھے۔ چند سرکاری مڈل اور چند تحتانی مدرسے تھے۔ عام طور سے انگریزی تعلیم کی طرف رجحان زیادہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے نظام کالج پر سالانہ کئی ہزار روپیہ خرچ ہونے پر بھی ایک دو سے زیادہ بی۔ اے برآمد نہیں ہوتے تھے مڈل کا امتحان سرکاری ہوتا تھا۔ ایک سو دو سو طلباء شریک ہوتے۔ مڈل کے امتحان کی بڑی قدر و منزلت تھی ۱۳۰۵ف میں جب ایک جاگیردار یعنی اعلیٰ طبقہ کے فرزند (سید جمال الدین زمانہ ما بعد صادق جنگ) نے اس میں بدرجۂ اعلیٰ کامیابی حاصل کی تو دوسرے امراء کے لڑکوں کی ترغیب کے لئے سرکاری طور پر جریدہ میں ان کی اس کامیابی پر اظہار خوشنودی کیا گیا۔

مدرسہ دارالعلوم پنجاب یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں فوقانی اور اعلیٰ تعلیم منشی۔ منشی عالم منشی فاضل مولوی۔ مولوی عالم۔ مولوی فاضل کی تعلیم کے ساتھ ابتدائی اور وسطانی تعلیم بھی ہوتی تھی سرکاری مڈل اور فوقانی اسکولوں میں مدراس یونیورسٹی کے مقررہ نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ میٹرک کا امتحان بھی مدراس یونیورسٹی کے تحت تھا۔

خواتین کی تعلیم کے لئے صرف ایک مدرسہ نام پلی

تھا جس میں تعلیم کا انتظام ہائی اسکول تک تھا مگر کوئی لڑکی اس جماعت میں نہیں تھی۔ لڑکیوں کی کل تعداد جو پہلی جماعت سے آخری جماعت تک تھی اکیسو کے اندر ہوتی تھی۔

یہ تو بلدہ حیدرآباد کی حد تک تھا اضلاع کی حالت اس سے بدتر تھی چند مڈل اور دو ایک ہائی اسکول تھے تحتانی اسکولوں کی تعداد پورے قلمرو آصفی میں چند سو پر مشتمل تھی۔

اخبارات روزانہ اخبارات سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی اس لئے جو اخبار شائع ہوتے وہ جلد بند ہو جاتے ایک دو روزانہ اخبار تھے یعنی مشیر دکن اور علم و عمل ان کی اشاعت روزانہ بمشکل ہزار بارہ سو ہوتی تھی اس میں بھی بڑا حصہ سرکاری طور پر دفاتر میں خریدا جاتا۔ البتہ جنگ ترکی اور یونان اور جنگ روس و جاپان شروع ہوئی تو باہر کے کچھ اخبار آنے لگے تھے لاہور سے وطن اور پیسہ اخبار (ہفتہ وار) اور مدراس سے مخبر دکن۔ نیر آصفی جریدہ روزگار (ہفتہ وار) آتے تھے مدراس کے اخباروں میں حیدرآباد کی سیاست اور عہدہ داروں کے متعلق تفصیلی مضامین ہوتے تھے۔ اس لئے یہ اخبار ہفتہ وار ہونے کے باوجود سو دوسو حیدرآباد میں آتے تھے دو ایک ماہوار رسالے شائع ہوتے تھے۔ مگر ان کی عمر زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

کتب فروشی جب علم سے دلچسپی نہیں تھی تو ظاہر ہے کتب کی فروخت کیسے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ حیدرآباد میں چار مینار کے پاس دو چار کتب فروشوں کی دوکانیں تھیں ان کے پاس بھی زیادہ تر یا تو قانونی کتب ہوتیں یا مدرسوں کی نصابی کتابیں اگر علمی اخلاقی تاریخی وغیرہ کتابوں کی ضرورت ہوتی تھی تو شمالی ہند سے یعنی دہلی لکھنؤ۔ لاہور سے منگوانی پڑتی تھیں ایک دو اصحاب ایسے موجود تھے جو شمالی ہند سے کتابیں طلب کرتے اور لوگوں کے مکان پر جاکر فروخت کرتے ان کے پاس مولانا شرر۔ نذیر احمد۔ مولوی شبلی وغیرہ کی کتابیں ہوتی تھیں لوگوں کو مطالعہ کا شوق نہیں تھا کتب خانہ آصفیہ میں آنے والوں کی تعداد چند افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان میں بھی زیادہ تر انگریزی اخباروں کا مطالعہ کرتے تھے۔

انجمنیں دو ایک علمی انجمنیں قائم تھیں مگر اس کی جانب لوگوں کی توجہ نہیں تھی اگر کسی انجمن کے جلسہ میں پندرہ بیس اصحاب شریک ہو جاتے تو جلسہ کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ علمی لکچرز جو ان انجمنوں میں ہوتے وہ زیادہ تر تعلیمی یا معاشرتی موضوع پر ہوتے تعلیم نسواں اور پردہ تعداد ازدواج وغیرہ جیسا کوئی عنوان زیادہ زیر بحث ہوتا تو رسالوں میں ان کے متعلق مضامین شائع ہوتے روزانہ اخبارات میں مضمون لکھے جاتے۔ چنانچہ مولوی محب حسین نے جب تعلیم نسواں اور پردہ کی مخالفت میں لکچر دیا تو ان کے موافق اور مخالف کئی اصحاب نے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے۔

اصحاب ذوق اور صاحبان علم کا اجتماع عام علمی جمود اور پستی کے باوجود حیدرآباد میں اصحاب علم اور ارباب دانش کی کمی نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے بہترین دل و

داغ یہاں موجود تھے مثلاً نواب محسن الملک (مولوی مہدی علی) نواب وقار الملک (مولوی مشتاق حسین) مولوی چراغ علی (اعظم یار جنگ) مولوی عزیز مرزا - پنڈت رتن ناتھ سرشار مولوی نذیر احمد ۔ ظفر علی خاں ۔ شرر ۔ مولوی شبلی ۔ سید علی بلگرامی مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) وغیرہ ۔ ان اصحاب کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی ۔ مگر یہ اصحاب بھی زیادہ تر سیاسی کشمکش اور سیاسی اُلجھنوں (پارٹی فیلنگ) میں گرفتار رہے۔

حیدرآباد میں شعر و شاعری کا چرچا ہر زمانہ میں رہا قطب شاہی سلطنت کے بعد جب مغلیہ دَور آیا تو اس وقت بھی ولی اور سراج کی وجہ سے مستقر حکومت اورنگ آباد میں شعر اور شاعری کا بازار گرم رہا اس کے بعد جب آصفیہ حکومت قائم ہوئی تو خود آصفجاہ اول اور راجہ چندولال کی وجہ سے شاعری کا بازار گرم رہا چنانچہ ارسطوجاہ کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد[1] دو جلد میں ترتیب پائے ہیں - راجہ چندولال کے پاس بیسیوں شاعر جمع تھے ۔ جن میں شمالی ہند کے شعرا بھی شامل تھے غرض اس طرح یہاں شاعری سے دلچسپی رہی میرے بچپن کے زمانہ میں شاعری سے لوگوں کو دلچسپی تھی [illegible] حضرت فیض کے عرس کے موقع پر مشاعرہ ہوتا اور اس میں شاگردان فیض کے علاوہ دوسرے شعرا حصہ لیا کرتے اور کلام کا مجموعہ شائع ہوتا تھا میکش حیدرآباد میں آکر ہی مسلمان ہو کر حضرت میر امداد علی علوی کے مرید ہوئے تھے میکش کے شاگردوں کا ایک الگ اسکول تھا۔

اس کے بعد حضرت داغ حیدرآباد آگئے اور ان کو حضور کی اُستادی کا موقع مل گیا۔ دو ہزار ماہوار اور خطاب ناظم یار جنگ دبیرالدولہ فصیح الملک بلبلِ ہندوستان سے ملقب کئے گئے اس زمانہ میں "کنتوری" اصحاب کی الگ جماعت تھی حبیب کنتوری ان کے سرگروہ تھے۔

اس تفصیل کے بعد اب میں اپنے حالات کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔ میرے والد مولوی عبدالقادر صاحب ترپ بازار میں اپنے ذاتی مکان میں رہا کرتے تھے یہ ایک کشادہ باغ تھا جس میں پانچ موٹ کی پختہ باؤلی تھی۔ باغ ترپ باغ سے موسوم تھا اور باؤلی ترپ باؤلی کہلاتی تھی میرے والد نے اس باغ کو خریدا تھا اور اس کے قدیم مکان کے علاوہ ایک اور مکان بنوایا تھا ۔ دونوں مکان اب تک موجود ہیں جو مکان خریدا گیا تھا وہ کسی زمانہ میں حکومت آصفیہ کی فرینچ فوج کا صدر مقام تھا ترپ کے لحاظ سے ترپ باغ کہلایا تھا۔

ترپ باغ کو میرے والد نے اپنی خوش سلیقگی سے خوشنما اور آراستہ کردیا تھا زیر زمین نلوں سے حوضوں میں پانی لایا جاتا اور فوارے چھوٹتے تھے۔ گلاب - موتیا - چنبیلی - جوئی - گل مہدی کے تختے لگائے گئے تھے میووں کے درخت تھے - انگور - موز - انار - جام -

---

[1] اس پر ایک تفصیلی مضمون مقالات ہاشمی میں شامل ہے ۔

آم۔ لیمو۔ وغیرہ ہوتا تھا اس میں ترکاری وغیرہ کی کاشت ہوتی تھی۔ ان سب کی بدولت باغ سرسبز و شاداب اور خوشبو سے معطر رہتا تھا۔ صبح اور شام میں درختوں کو پانی دیا جاتا شام کو مالی اور مالن چمن کے کونڈوں میں پانی ڈالا کرتے۔ باغ میں پردہ بھی کرایا جاتا اور مستورات تازہ ہوا کا لطف باغ کی سیر میں اُٹھاتی تھیں۔

میرے والد خوش پوش خوش سلیقہ خوش اخلاق تھے علمی اور معاشرتی انجمنوں سے دلچسپی تھی ہر جمعہ وہ انجمنوں کے اجلاس میں شریک ہوتے تھے۔

میرے والد کا روزانہ پروگرام یہ ہوتا وہ قبل طلوع آفتاب بیدار ہوتے نماز و وظائف کے بعد تلاوت قرآن مجید کرتے آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد لکھنے میں مصروف ہوجاتے۔ جب تک حدیث کی دو چار سطریں نہ لکھتے کوئی دوسری تحریر نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بچوں کو درس بھی دیا کرتے نو بجے کھانا کھاتے اور اس کے بعد دفتر جاتے۔ دفتری لباس عربی وضع کا سفید عمامہ سفید یا چینا سلک کی شروانی اور اُس پر چینا سلک کا جبہ ہوتا پاؤں میں چڑاوے پہنا کرتے۔ واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ رجسٹری کی کمیشنوں پر جاکر آتے تھے اور رات کا کھانا آٹھ بجے تک کھا لیتے تھے رات میں عموماً وہ روٹی کھاتے تھے۔ جمعہ کے دن بعد نماز ظہر قبل عصر کسی نہ کسی انجمن کے جلسہ میں شریک ہونے جاتے کوئی جمعہ ان جلسوں سے خالی نہیں ہوتا تھا دعوت میں جانا ہوتا تو جبہ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ریشمی کپڑے کی شروانی استعمال کرتے کبھی کبھی ہم بچوں میں سے کسی کو ساتھ لے جاتے تھے۔

ہمارے خاندان کی مستورات دعوتوں میں مخصوص گھروں کو جاتی تھیں عموماً صرف "خاندان نوائط" کی حد تک آمد و رفت تھی چار سال سے کچھ زیادہ ہونے پر بھی میں اپنی والدہ کے ہمراہ زنانہ دعوتوں میں جاتا تھا۔ میری والدہ ان دعوتوں میں سب سے گھل مل نہیں جاتی تھیں ان کی دو چار ہی ملاقاتی تھیں اس لئے وہ مغرور سمجھی جاتی تھیں حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ وہ بہت دھیرے دھیرے دوستی کرتی اور دوستی کو نبھاتی تھیں۔

روزانہ بعد مغرب نانا صاحب کے مکان میں ہمارے پھوپا مولوی صفی الدین صاحب مولوی عبداللہ صاحب اور نانا صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی خلیل اللہ صاحب آجاتے تھے اور والد بھی رہا کرتے ان صاحبان میں حیدر آباد کی سیاسی تاریخی علمی گفتگو سب کا موضوع ہوتا تھا۔ ہم بچے ان باتوں کو سنا کرتے میرے بڑے ماموں مولوی محمد غوث مرتضےٰ صاحب انگریزی سے واقف تھے وہ انگریزی اخبار پڑھ کر واقعات سُنایا کرتے خصوصاً جنگ روس و جاپان کے واقعات کا مجھے اچھا خیال ہے کبھی کبھی شعر بازی بھی ہوتی تھی۔ نماز جماعت سے ادا ہوتی کبھی قرآن کے ختم ایصالِ ثواب کے لئے پڑھے جاتے خاندان کے سب مَرد شریک ختمِ قرآن ہوتے تھے۔ ہوائی جہاز کا آغاز ابھی ہوا تھا اخبار میں اس کے تجربے کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

صبح دوپہر اور شام کو دسترخوان پر سب کھاتے تھے۔ جس زمانہ میں والدہ اپنے باغ میں ہوتیں تو نانا صاحب

اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ نماز جمعہ (جو وہ ابن صاحب کی مسجد میں ادا کرتے تھے) کے بعد ہمارے یہاں آجاتے اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کرکے اپنے مکان کو جاتے تھے۔

اہلِ خاندان کی تقریبات اور خود ہمارے یہاں کی تقریبات اور والد کی دعوتیں

نماز شریف کے موقع پر اہل خاندان والد کے مکان میں آکر دو دو چار چار دن مہمان رہا کرتے تھے کبھی کبھی مدراس سے دادی صاحبہ اور چچا صاحبان بھی آتے تھے میری ہمشیرہ کی شادی ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں ہوئی مجھے اس کا پورا خیال ہے اس زمانہ میں میری عمر آٹھ سال کی تھی اس کے بعد ۱۳۲۳ھ میں ماموں حامد صبغۃ اللہ صاحب کی شادی ہوئی اس وقت بھی مدراس سے بہت سارے اہل خاندان آئے تھے۔ ہمشیرہ کی شادی کے وقت دادا صاحب (غلام محمد شرف الدولہ) اور دادی صاحبہ معہ خاندان اور چچا صاحب معہ اہل و عیال آئے تھے۔ دادا کو میں نے پہلی اور آخری مرتبہ اس وقت دیکھا بڑے اونچے تھے ڈاڑھی سفید اور دراز تھی چہرہ سے رعب آب ظاہر ہوتا تھا ان تقریبات کے زمانہ میں ہمارے مکان اور نانا صاحب کے مکان میں بڑی دھوم دھام ہوتی عزیز و اقارب کئی کئی دن تک مہمان رہا کرتے والدہ سب کی مہمانی بڑی مسرت اور خوشی سے کرتی تھیں۔ قسم قسم کے میٹھے تیار ہوتے تھے۔ ان کے تیار کرنے میں میری والدہ کو دوسری رشتہ دار عورتیں بھی مدد دیا کرتی تھیں۔

ہمارے باغ میں اور نانا صاحب کے مکان میں ہمارے پھوپی زاد بھائی اکثر آتے اور ہم سب مل کر کھیلتے تھے آپس میں کبھی لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔ میری والدہ نانی صاحبہ کی بڑی دختر تھیں ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں وہ نانا صاحب کے مکان اپنی اولاد کے ساتھ جاتیں اور ہفتہ عشرہ قیام کرتیں نانا صاحب کے آمد و خرچ کا حساب والدہ صاحبہ سے ہی متعلق ہوتا تھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں میری پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک کا زمانہ بسر ہوا۔ اس ماحول میں میری تربیت ہوئی۔ بلا کسی ہمراہی ملازم کے ہم گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔

اب میں اپنے تعلیمی حالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کیونکہ اوراق ماقبل میں اس کا تذکرہ نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے مجھے الف۔ب کا درس یاد نہیں ہے البتہ اس زمانہ کا خیال ہے جب میں اُستاد محمد غوث صاحب کے پاس قرآن شریف کا پارہ عم پڑھ رہا تھا اس کے ساتھ حساب میں جمع تفریق اور خطاطی کی مشق کرتا تھا۔ صبح کو قرآن مجید کا درس ہوتا دوپہر کو کھانے کے بعد خطاطی کرتا اور سہ پہر کو حساب اور اُردو کا سبق لیا کرتا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی اُردو کی پہلی کتاب زیر درس تھی۔ دوسرے بھائی بھی ان ہی اُستاد محمد غوث صاحب کے پاس پڑھا کرتے تھے۔ بڑے بھائی مولوی خلیل اللہ صاحب کے مکان پر درس کے لئے جاتے ان کا ایک یابو تھا اس پر سوار ہوکر جاتے تھے۔ دوسرے دونوں بڑے بھائی اور میں صبح دس بجے کے پہلے (کیونکہ اُستاد دس بجے آتے تھے) والد کے پاس

درس لیا کرتے۔ میں کریما (بلا معنی) اور گلدستۂ معرفت، معجزاتِ نبوی کی کتاب جو مولوی خلیل اللہ صاحب نے بچوں کے لئے لکھی تھی، پڑھا کرتا گلدستۂ معرفت ختم ہونے پر مولوی نذیر احمد کی منتخبہ حکایات شروع کی گئی تھی۔

میرے والد ان اصحاب میں شامل تھے جو اولاد کو ابتداسے مدارس میں شریک کرنے اور انگریزی پڑھانے کے مخالف تھے۔ وہ مشرقی تعلیم کو مقدّم تصوّر کرتے تھے اور مدرسہ کی تعلیم کے اس لئے مخالف تھے کہ تربیت کو وہ ضروری جانتے تھے مدرسہ میں ہر طبقہ کے طلبا ہوتے ہیں اور اخلاقی لحاظ سے اس کا اثر ہونا ناگزیر ہے اس لئے بچوں کی ابتدائی تعلیم وسطانی حد تک گھر پر ہونے کا خیال تھا چنانچہ اس اصول پر ہم بھائیوں کی تعلیم گھر پر ہوتی تھی۔ البتہ بڑے بھائی کو مدرسہ دار العلوم میں شریک کیا گیا تھا۔ دار العلوم میں پھوپی کے لڑکے مولوی محمد مرتضیٰ صاحب۔ محمد مظہر صاحب۔ قادر مرتضیٰ حسین صاحب اور میرے ماموں حامد صبغۃ اللہ صاحب تعلیم پاتے تھے۔

میری صحت بچپن میں اچھی نہیں رہتی تھی مہینہ دو مہینہ کے بعد کوئی نہ کوئی عارضہ ہو جاتا بخار۔ کھانسی وغیرہ معمولی بیماریوں کے قطع نظر ایک مرتبہ بچپن نو ماہ تک اور دوسری مرتبہ بواسیر کی شکایت تین چار ماہ تک رہی بیماری کی وجہ سے پرہیز کرنا ہوتا کئی ماہ تک مسلسل پرہیزی غذا یعنی چاول کی چپاتی اور ترائی کے ساتھ کھانی پڑی۔

ان بیماریوں کی وجہ سے میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور کئی کئی ماہ تک میری تعلیم نہیں ہو سکی اس سلسلۂ تعلیم کے وقفہ کی وجہ سے بارہ سال کی عمر تک صرف ابتدائی اور کسی قدر وسطانی تعلیم ہوئی تھی۔

۱۳۲۳ھ میں میرے ماموں حامد صبغۃ اللہ صاحب کی شادی ہوئی اس کا پورا انتظام میری والدہ اور والد کے ذمہ تھا۔ کئی دن تک دعوتوں کے سلسلے جاری رہے۔ شعبان ۱۳۲۳ھ کو میرے دادا کا انتقال ہوا والد کی بیماری کا سلسلہ بھی آغاز ہو گیا تھا کھانسی تھی اور سینہ سے خون آتا تھا۔ پہلے ڈاکٹر سید احمد صاحب کا علاج رہا پھر یونانی علاج ہوتا رہا بخار بھی آنے لگا۔ بیماری کی حالت میں والد دفتر کو جاتے تھے۔ کیونکہ دفتر رجسٹرار بلدہ اس وقت غیر سرکاری حالت میں تھا۔ آمدنی سے سرکار کچھ استفادہ کرتی اور باقی رقم سے اہل دفتر کی تنخواہیں ادا ہوتی تھیں چونکہ زمانہ رخصت کی تنخواہ نہیں ملتی تھی اس لئے مجبوری تھی۔ مگر جب بیماری زیادہ ہوگئی تو رخصت لی گئی۔ اس زمانہ میں خدا نے ایک صورت یہ پیدا کر دی کہ دونوں مکانوں کو دفتر ضلع اطراف بلدہ کے لئے کرایہ پر مولوی رحیم الدین خاں (رحیم یار جنگ) نے حاصل کر لیا۔ والد صاحب نے اپنا تمام سامان ایک دوسرے چھوٹے مکان میں منتقل کر دیا اور خود مع اہل و عیال نانا صاحب کے مکان میں فروکش ہوئے کیونکہ بیماری کے باعث سردست علٰحدہ مکان میں رہنا دشوار تھا۔ اس زمانہ میں مرحوم اعلیحضرت میر محبوب علی خاں کی چہل سالہ جوبلی ہوئی جس کا تذکرہ قبل ازیں کر دیا گیا ہے۔

بیماری کے باعث والد جوبلی کی بعض تقریبات میں شریک نہیں ہوسکے جوبلی کے تمام تقریبات کے موقعہ آتے تھے مگر مجبوری تھی۔

والد کی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی دق ہوگئی تھی بعض ڈاکٹروں کے کہنے سے سمندر کی ہوا کے لئے مدراس جانا طے ہوا چنانچہ یہاں پہونچنے کے بعد والد اور زیادہ فراش ہوگئے اور بالآخر اپنے باپ کے انتقال کے گیارہ ماہ بعد ۲۲ رجب ۱۳۲۴ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ مدراس کی جامع مسجد میں دفن ہوئے۔

اس موقع پر چند باتوں کا اظہار کرنا ضروری ہے جس کا میری آئندہ زندگی پر اثر ہونا ناگزیر تھا میں یہ بیان کرچکا ہوں کہ میرے والد کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا مضامین کے علاوہ مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہوئی موجود ہیں اگرچہ ان کا بڑا حصہ غیر مطبوعہ ہے اور یہ تصنیف کا ذوق و شوق میری خاندانی اسپرٹ رہی چنانچہ اس کے بعد جب میں دس گیارہ سال کا تھا اور اُردو کی دوسری کتاب زیر درس تھی تو خیال ہوا کہ اُردو کتابوں کے اشعار کو ردیف وار جمع کروں تاکہ شعربازی کے موقع پر شعر کہنے کے لئے سہولت اور آسانی ہو۔ چنانچہ جب میں نے یہ خیال ظاہر کیا تو والد بہت خوش ہوئے اور کاغذ پر مسطر کھینچ کر دئے تاکہ سطر سیدھی ہو اور کتاب کا نام "گلزار نصیری" قرار دینے کی رائے دی۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کو ۱۳۲۳ھ میں مرتب کیا اس میں اُردو کی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب انجمن حمایت اسلام لاہور کے اشعار کو ردیف وار لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا مخطوطہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔

مجھے بچپن سے سلیقہ شعاری۔ صفائی وغیرہ کا شوق رہا اور ان چیزوں میں میں اپنے سے کم عمر بلکہ عمر میں بڑے بچوں سے بھی سبقت لے جاتا تھا۔

بچپن کا ایک اور واقعہ بھی قابل اظہار ہے کہ جس وقت میری عمر تین چار سال کی تھی تو مجھے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ میری ایک آیا تھی اس کو اُردو کی اچھی اچھی کہانیاں سبز پری۔ کل کا گھوڑا۔ وغیرہ کی آتی تھیں اور وہ ان کہانیوں کو اس خوبی سے بیان کرتی تھی کہ میرے بڑے بھائی بھی اس کو خوشی مسرت اور شوق سے سننے کے لیے میری آیا کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ کہانی کا سلسلہ رہتا تھا نئی نئی کہانیاں وہ بیان کرتی تھی۔

میرے نانا حکومت آصفیہ کی ملازمت کے بعد آسمان جاہی پائگاہ کے میر مجلس تھے' نواب معین الدولہ امیر پائگاہ کے پاس کبھی کبھی میں اپنے نانا کے ساتھ جاتا تھا۔ اس طرح نواب صاحب کے ہمراہ شکار اور تفریح میں رہنے کا موقع ملا، جاگیردارانہ زندگی کا معائنہ کرنے کا قریب سے موقع ملا۔

میری مدرسے کی تعلیم

۱۳۲۸ھ تک میری تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ مولوی محمد غوث صاحب اُستاد کے علاوہ میں اپنی والدہ سے اُردو فارسی کی تعلیم پاتا رہا ۱۳۲۷ھ میں میرے نانا کا انتقال ہوا اور اس کے بعد ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ دارالعلوم میں شریک کیا گیا۔ اس زمانہ میں

میرے دو بھائی عبدالشکور صاحب مولوی کی جماعت میں اور فریدالدین صاحب دبیر کی جماعت میں تعلیم پا رہے تھے بڑے بھائی مولوی محمد عبدالرؤف صاحب ملازمت کے لئے سرگرداں تھے۔

مجھے مدرسہ دارالعلوم کی چوتھی جماعت میں لیا گیا اس زمانہ میں چھ جماعتیں وسطانیہ حد تک تھیں چھٹی جماعت جو مڈل کے مماثل تھی وہ "رشدیہ" کے نام سے موسوم تھی اس کے اوپر فارسی کی میٹرک "منشی" اور عربی کی میٹرک "مولوی" کہلاتی تھی اور فارسی کی کالج کی جماعتیں دبیر اور ادیب سے موسوم تھیں۔ یہاں دو دو سال کی تعلیم ہوتی تھی عربی کی جماعتیں عالم۔ فاضل۔ اور کامل سے موسوم تھیں۔ ہر جماعت کی تعلیم دو دو سال کی تھی یعنی فارسی کی تعلیم چار سال میں ختم ہو جاتی تھی مگر عربی تعلیم چھ سال تک ہو سکتی تھی۔ جس وقت میں مدرسہ میں شریک ہوا اس وقت کالج کی کل جماعتوں میں تقریباً پچیس تیس طلبا تھے۔ البتہ فوقانی۔ وسطانی۔ اور تحتانی درجوں کے طلبا کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ تھی مولوی الٰہی بخش صاحب پورے مدرسہ دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے۔ انکی ماہوار صرف تین سو روپیہ تھی۔ دوسرے اساتذہ جو اس وقت موجود تھے ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

مولوی ابوبکر بن شہاب
مولوی سید نادرالدین صاحب
مولوی حبیب الرحمٰن بیدل
مولوی محمد عباس صاحب
مولوی عبدالقدیر صاحب
مولوی سید تاج الدین صاحب
مولوی سید شاہ مصطفےٰ صاحب
مولوی سید اشرف صاحب شمسی
مولوی میر موسیٰ حسین صاحب
مولوی احمد حسین صاحب
مولوی عبدالواسع صاحب
مولوی خواجہ شرف الدین صاحب
مولوی احمد مدنی صاحب
مولوی محمد عمر صاحب
مولوی عبدالباری صاحب وغیرہم

یہ سب صاحبان اعلےٰ جماعتوں کو تعلیم دیتے تھے۔

میں نے گھر میں فارسی کی تعلیم گلستاں تک پائی تھی۔ مگر عربی کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اس لیئے مجھے جماعت چہارم میں شریک کیا گیا۔ اس وقت دارالعلوم میں مولوی شبلی کا مُرتبہ نصاب رائج تھا۔ درس کے پانچ گھنٹے ہوتے تھے۔ چار پانچ ماہ کے بعد جب سالانہ امتحان ہوا تو میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا اور پانچویں جماعت میں ترقی مل گئی۔

اسی زمانہ رمضان ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا انتقال ہو گیا اس کے بعد حیدرآباد میں پہلی مرتبہ طاعون آیا روزانہ صدہا آدمی مرنے لگے۔ مدارس کی تعطیل ہو گئی۔ ہمارے کنبہ نے بھونگیر جا کر قیام کیا۔

پانچویں جماعت میں فارسی۔ عربی۔ انگریزی حساب

کے علاوہ تاریخ دکن اور جغرافیہ دکن اردو زبان میں تھے ان کی تعلیم حضرت امجد کو تفویض تھی۔ پہلی مرتبہ میں حضرت امجد سے روشناس ہوا۔ نام تو میں نے بیشتر بھی سنا تھا مگر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ میری شرکت مدرسہ کے زمانہ میں آپ ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ کے لئے گئے ہوئے تھے اب وہاں سے واپس آئے تھے۔

تاریخ سے مجھے فطرتی مناسبت تھی اس لئے اس کو از ابتدا تا انتہا زبانی یاد کرلیا گیا تھا۔ اس بنا پر مجھ سے امجد صاحب محبت کرنے لگے۔

اس طاعون کی تعطیلات کے بعد سالانہ امتحان تھا مگر اس کے چند ماہ بعد رشدیہ کے سالانہ سرکاری امتحان کی تاریخ مقرر تھی اُستادوں نے رشدیہ کا امتحان تین ماہ کے بعد دینا مشکل بتایا اور کہا کہ تین ماہ اسی پانچویں جماعت میں رہو اور تین ماہ کے بعد چھٹی جماعت رشدیہ میں داخلہ مناسب ہوگا۔ اساتذہ کی خواہش کے مطابق میں پانچویں جماعت میں ہی پڑھتا رہا اور پھر چھٹی جماعت میں ترقی ملی۔ اس جماعت کا سالانہ امتحان سرکاری سررشتہ تعلیمات کی جانب سے ہوتا تھا جو نصاب اس جماعت کا تھا وہ حسب ذیل ہے:-

فارسی نصاب میں، نامہ خسروی کا پہلا حصہ اور فارسی کا ایک مجموعہ جس میں گلستان بوستان۔ اخلاق محسنی وغیرہ کا انتخاب تھا اور قواعد میں مصدر فصوص شامل تھے۔ عربی میں صرف نحو اور ادب کی ایک کتاب۔

تاریخ میں تاریخ ہند اور جغرافیہ عالم۔ حساب میں پورا علم الحساب۔ چھٹی جماعت کے بھی دو حصے تھے کیونکہ طلبا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض طلبا کی کوشش سے جن میں میرا بھی بڑا حصہ تھا ہماری جماعت کی پوری تعلیم حضرت امجد کو تفویض ہوگئی تھی عربی۔ فارسی ریاضی اور تاریخ وجغرافیہ سب کچھ وہ پڑھاتے تھے۔ ریاضی چونکہ مشکل تھی اور بہت زیادہ حصہ تھا اس لئے دو دو گھنٹے ریاضی کی تعلیم ہوتی اور مکان پر کرنے کے لئے بھی ہوم ورک ملتا تھا۔ اس کے پہلے ہوم ورک سے ہم طلبہ واقف نہیں تھے۔ مدرسہ میں جو سبق ملتا تھا اس کو مدرسہ میں ہی یاد کرلیتے تھے بعض طلبا امجد صاحب کے گھر جاکر بھی ریاضی کی مشق کرتے تھے اس زمانہ میں امجد صاحب حضرت اصغر حسینی کے مکان واقع کوچہ فتح اللہ بیگ میں رہا کرتے تھے۔ صابر حسین صاحب آپ سے درس لیا کرتے تھے صابر حسین صاحب اسی زمانہ میں مدرسہ دارالعلوم میں مولوی کی جماعت میں شریک تھے اور سید محمد پاشا حسینی صاحب مولوی عبدالواسع صاحب کے ہمراہ آتے اور مولوی صاحب کے پاس درس لیتے تھے کسی جماعت میں شریک نہیں تھے۔ جس طرح میرا بچپن تھا اسی طرح سید محمد پاشا حسینی صاحب صابر حسینی صاحب کا بچپن تھا۔ البتہ صابر حسینی صاحب مجھ سے عمر میں کسی قدر بڑے تھے۔ اس زمانہ میں میرے ساتھ کون کون ہمدرس تھے افسوس ہے کہ ان کے نام یاد نہیں البتہ ایک صاحب تجمل حسین (حال ڈاکٹر تجمل حسین مالک تاج کلے ورکس) یاد ہیں۔ دوسرے حصے میں جو طلبا تھے ان میں ایک ضیاء الدین

اور دوسرے ابو الفتح نصر اللہ۔ ایک میڈی لال اور ایک ہدایت احمد صاحب جو حبیب الرحمٰن بیدل کے عزیز تھے۔ یہ طلبا دوسرے سال ایک ہی جماعت میں آگئے تھے جن کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

رشد یہ کا سرکاری امتحان ہوا۔ باغ عام کے اڈرس ہال میں یہ لیا گیا تھا فارسی پرچہ میری دانست میں نہایت آسان تھا اور اس کو میں عجلت میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ختم کر کے باہر آگیا اس عجلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں فیل ہوگیا۔ جو نمبرات حاصل کیے گئے تھے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) فارسی ۱۷ (۲) عربی ۳۶ (۳) ریاضی ۳۶
(۴) تاریخ جغرافیہ ۳۰ (۵) ترجمہ فارسی اردو ۴۲

میرے خیال کے مطابق مجھے فارسی میں ۸۰ نمبر ملنے تھے کیونکہ سب سوال صحیح لکھے گئے تھے مگر نہ معلوم کیوں ممتحن صاحب نے ظلم کیا اس کے ممتحن سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ دہلی میں تھے۔ میرا خیال ہے چونکہ میرا خط نہایت خراب تھا اس لئے ممتحن صاحب نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی۔ بہر حال مجھے اپنے فیل ہونے کا بہت رنج ہوا۔ کئی مہینے ملال رہا۔

اب مدرسہ کے نصاب میں تبدیلی ہوگئی اور مڈل تک چھ جماعتوں کی بجائے سات جماعتیں کر دی گئیں یعنی ہفتم کی ایک جماعت اور بنی اس لئے میں فیل ہونے کے باوجود گویا ایک اور جماعت میں ترقی پاگیا مگر نصاب بدستور پہلا رہا انگریزی کی تعلیم موقوف ہو چکی تھی۔

یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ جس زمانہ میں میں پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا تو کئی ماہ تک بیماری کی وجہ سے تعلیم موقوف رہی ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا انگریزی تعلیم سے دماغ پر زیادہ زور پڑ رہا ہے اس لئے انگریزی کو چھوڑ دیا گیا مگر چھٹی جماعت میں انگریزی تھی اس لئے انگریزی کی صرف دو کتابیں پڑھیں۔ جماعت ہفتم میں اساتذہ تبدیل ہوگئے تھے۔ احمد مدنی صاحب جو ابو الفتح نصر اللہ صاحب کے والد تھے وہ ریاضی کے لئے محمد عمر صاحب تاریخ اور جغرافیہ کے لئے۔ غلام جیلانی صاحب عربی کے لئے۔ اور خواجہ شرف الدین صاحب فارسی کا درس دیا کرتے تھے۔

جن طلبا کا اوپر ذکر ہوا وہ اب میرے ساتھی بن گئے تھے۔

تعلیم کے علاوہ مکان پر ہوم ورک کرتا رہا۔ سرکاری امتحان ہوا اور میں نے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس وقت بھی تاریخ میں زیادہ نمبر حاصل کیئے گئے تھے۔ بعد کامیابی میں جماعت مولوی میں شریک ہوا۔ مولوی کی جماعت گویا میٹرک کی جماعت تھی جو عربی سلسلہ کی جماعت تھی۔

(باقی آئندہ)

"خلاصۃ الانساب حافظ رحمت خاں"

(از جناب سخاوت مرزا بی۔اے۔ایل ایل بی)

محترمی سید الطاف علی بریلوی بی اے نے اپنی تالیف حیات حافظ رحمت خاں والیٔ روہیلکھنڈ (وفات ۱۱۸۸ھ) میں حافظ صاحب کی ایک تالیف "خلاصۃ الانساب" کے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو بریلوی موصوف کے پاس موجود ہے۔ اور دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ ہم کو اسی کتاب کا ایک تیسرا نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم حیدرآباد میں دستیاب ہوا ہے جس کا ہم سطور ذیل میں ذکر کرتے ہیں مولانائے موصوف نے "حیات حافظ رحمت خاں" میں تحریر فرمایا ہے کہ بقول مرحان اسٹریچی حافظ الملک بڑے اہل ذوق اور اہل ہنر تھے، ان کے پاس ایک بڑا ذخیرہ کتب تھا بعد شکست و شہادت حافظ صاحبؒ نواب شجاع الدولہ تمام ذخیرہ کتب لکھنؤ لے گئے جو بعد میں شاہان اودھ کے کتب خانہ میں شامل ہو گیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی۔ جو اسپرنگر کیٹلاگ کے نام سے معروف ہے ۱۸۵۴ء میں گویا غدر سے تین سال قبل فہرست مذکور شائع ہوئی۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ ان کو اسلحہ خانہ شاہان اودھ میں چالیس صندوق خراب و خستہ حالت میں ملے تھے جن میں حافظ رحمت خاں کا علمی خزانہ محفوظ تھا انہیں پیٹیوں کی تصانیف بھی تھیں جو اس روہیلہ سردار کے ایماء سے لکھی گئی۔ تھیں ۱۸۵۷ء کے غدر میں لکھنؤ کا کتب خانہ برباد ہو گیا۔ پھر بھی کافی تعداد میں اس کی کتابیں دستیاب ہوتی رہیں۔ حافظ الملک کے ذخیرہ میں کتاب زیر بحث المعروف بہ خلاصۃ الانساب بھی ہے جو مؤلف موصوف کو بڑی کوشش سے دستیاب ہوئی تھی، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ سید الطاف علی صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ نواب صاحب کی علم پرستی کی وجہ سے پانچ ہزار علماء فضلاء مساجد اور سرکاری مدارس روہیلکھنڈ میں موجود تھے۔

مخطوطہ خلاصۃ الانساب کتب خانہ سالار جنگ

اوراق ۱۰۷، یعنی ۲۱۵ صفحات تقطیع متوسط خوشخط نستعلیق کاغذ ولائتی انگریزی کاتب محمد صبح العالم سنبھلی سنہ کتابت ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۹۴ھ حسب ایماء ولیم چیمبر ہس کی گئی۔ دو مہریں۔ [نواب منیر الملک ۱۲۰۶ھ] ثبت ہیں:۔ تصنیف ۱۱۸۴ھ مصنف حافظ رحمت خاں۔

ابتدای الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین حمد بے حد مر خالقے راکہ مکونات را جہت اظہار ربوبیت خویش

از ظلمت عام پدیدار و تمامی کون و مکانرا جہت معرفت خود ابداع نمود۔ الخ۔

وجہ تصنیف | شہ میگوید بندۂ عاصی پر معاصی امیدوار مغفرت حافظ رحمت ابن شاہ عالم کوتہ خیل بدل زئی برتیج سرہٗ — دیدم کہ اکثر اشراف زادگان ولایت بحسب قسمت آبخور از ملک وطن خویش بے جا شدہ اند و در ہندوستان متوطن شدہ اند پشت در پشت گذشتہ آل و اولاد ایشاں انساب خود را فراموش زدہ ہیچ نمی دانند کہ با کسے نزدیکتر و کدام با کدام قریب تر است، و این قدر نمی توانند کہ فلاں خیل و فلاں قوم ہستیم بسا چونکہ بندہ ہم آباعن جدٍ ولایت زاۓ چنانچہ قبلہ گاہی الوی اعلام بندہ از راہ قسمت آبخور بہ ہندوستان آمدہ ساکن شدہ بودند بندہ ہم در ایشاں آمد و طرح اقامت در یجا انداخت راقمی مخدوم کوتہ خیل بر پس و پیش ہمچنیں اندہ در اینجا مجتمع گشتند تا بجدے کہ در ولایت وطن ہیچکس از مردم کوتہ خیل نماندہ ہمہ در اینجا آمدند ما پس چونکہ بندہ و راد ایشاں را نیز توالد و تناسل شدہ جمع کثیر گشتیم ہر چندکہ از فرزندان سعادت منات خود و اولاد ایشاں از نسب خود شناختن اقربا و ذوی القربا استفساری نمائم ہیچ نمیدانند و قریب و بعید را نمی شناسند لاجرم انچہ سائل حقیر بہ توجہ است ۔ خود وغیرہ اطلاعی بودہ فراخور علم در روش خود بیان نمود الخ۔

بعض ماخذ | تواریخ خان جہانی ۔ تواریخ شیر شاہی تذکرہ برہان السالکین اخوند درویزہ قدس سرہٗ ۔ افزوں بیانات ثقات معتبر در رہ جائے ہر قوم تفتیش و تحقیق کردہ مطابق علم استعداد خویش تصنیف شدہ

نام کتاب | مرتب گردید و بہ خلاصۃ الانساب مسمیٰ گشت۔

خاتمہ | آخر میں مناجات کے بعد شیخ آدم بنوری مجددی کا اسم مبارک اور یہ عبارت ہے "شمع جمع اہل سنت شیخ احمد مجدد الف ثانی" جس سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ حضرت مجدد الف ثانی رح کے معتقد تھے

قطعہ تاریخ تصنیف | واز ہمایوں ماہ رجب بہنگام فرخ بوقت طرب بتاریخ میمون کہ بریک ہزار فزوں بود یکصد ہشتاد و چہار کو بعون الہی و فضل رسول شدہ ختم این نسخہ دل قبول۔

ترجمہ نام کاتب و مصنف | تمت ہذہ کتاب الموسومۃ بخلاصۃ الانساب بعون الملک الوہاب من تصنیف حافظ رحمت غفر اللہ ولہ فی التاریخ الثالث والعشرین من شہر المیمونۃ ذی الحج یوم الاربعاء وقت العصر فی سنۃ الاربعۃ والتسعین بعد المائتۃ والالف من ہجرۃ النبویہ ۔ کتابۃ علی حسب الایماء الصاحب الصراتب عالی المناقب المسمی و بہم چنبر س سلمہ اللہ الواہب و فاز اللہ علی ارفع المناصب بید اضعف العباد النحیف عبد المذنب المجرم محمد صبیح العالم السنبھلی ۔ ہر کہ خواند دعا طمع دارم

مہر - | منیر الملک ۱۲۰۶ھ |

گویا یہ نایاب نسخہ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے چھ سال بعد ہی کا مکتوبہ ہے۔

شیخ کوتہ شہاب الدین کوتہ سے مراد لقب سگ جناب رسالت پناہ صلعم، بقول نسبت خود بہ سگت دادم

ویس متعلم بدل زی مضافات قندھار وطن اصلی برتپالت نیز ملک ہزارا۔ ملک چملہ۔ ملک سمو لعض قبایل۔ چوپان زئی بدل زئی۔ ملاخیل۔ دولت خیل طریقہ قادریہ کے پیرو تھے شیخ شہاب الدین کوتہ خیل۔ کی وفات و مدفن ملک نج ہزارہ متصل موضع شاہی دیر ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ مشہور دوندیا خاں۔ حسن ابن موتی ابن شیخ شہاب الدین کی اولاد سے تھے حافظ رحمت خاں کے والد ماجد شاہ عالم بیو موتی ابن شیخ شہاب الدین کی نسل سے تھے۔ اور ۱۰۸۴ھ میں ہندوستان آئے تھے۔ شیرانی، ترین اور میانی افغاناں شرف الدین ابن سرہٗ بن قیس عبد الرشید کے اولاد سے ہیں۔

شرف الدین ترین کے اسپین ترین (گندمی رنگ سرخ سفید)، ان کے فرزندوں میں ایک تور ترین (سیاہ رنگی)۔

میانی ابن شرف الدین ابن سرہٗ۔ دلوی داؤد خانی توخی، وغیرہ خیر الدین ابن سرہٗ کی اولاد میں مہتد ابن غوری کے بارہ لڑکے تھے جن میں موسیٰ زی یعقوب زئی اور مندوزئی۔ کوکو زئی۔ بہادر زئی وغیرہ تھے۔ ترین اور میانی پٹھانوں کا میں نے اس لئے یہاں ذکر کیا ہے کہ اس خاندان کے افغانوں نے عادل شاہی و آصفجاہی۔ دور میں جنوبی ہند کے اضلاع بیجاپور اور کرپہ میں ڈھائی سو سال حکمرانی کی ہے عبد الکریم خان میانہ وعبد الحکیم خاں وعبد الرؤف خاں دلیر جنگ وغیرہ حیدرآباد کے مشہور مورخ، غلام امام خاں مجر مؤلف تاریخ خورشید جاہی ترین قبیلے سے تھے۔ اور مشہور خطیب و لیڈر۔ نواب بہادر خاں مندوزئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

فاربس واٹسن لکھتا ہے۔ پٹھان جنگجو، بہادر سخت قوم ہے مگر سرکش ان کو نظم میں رکھنا دقت طلب ہی ہے۔ یہ پیدل فوج میں کم شریک ہوتے ہیں، سوار فوج کے لئے بڑے موزوں ہیں عام مسلمانوں سے رشتہ ازدواج قائم نہیں کرتے اس لئے ان میں قومی حمیت اور پٹھانی خون باقی ہے بہت سے گورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ آنکھیں بھوری یا نیلی، بھورے بال والے۔ عورتیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہیں بمشکل قابو میں رہتی ہیں دیسی حکومتوں میں کامیاب صوبیدار بھی رہ چکے ہیں۔ بعض نے قدیم مذہب چھوڑ کر شیعی اور مہدوی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ جہاں جہاں ان کی حکومتیں رہیں عالی شان عمارتیں۔ مثلاً دہلی، آگرہ، بیجاپور، مانڈو اور برہان پور میں ان کی یادگار موجود ہیں۔ ویران محلات۔ مساجد مقبرے ان کے بانیوں کی یاد کو تازہ کرتے ہیں ان کی اعلیٰ قابلیت قلعہ سازی، فن تعمیر۔ خوش منظر تعمیرات ہندوستان میں مابہ الامتیاز ہے۔ انہیں پٹھان سوارہ فوج نے علاؤ الدین خلجی کے ہمراہ ۱۳۱۱ء میں دکن پر حملہ کیا تھا۔ اور مسلمانوں نے وہاں حکومت قائم کرلی پٹھان سوارہ فوج نے حسن گنگو بہمنی کی سرکردگی میں شاہی فوج کو شکست دی تھی۔ اسی زمانے سے پٹھان دکھن میں آباد ہوگئے قانون اسلام میں لکھا ہے کہ پٹھان "فتحان" کی بگڑی ہوئی صورت ہے "فتحان" کا لقب عطیہ رسول کریم صلعم ہے۔

(PEOPLE OF INDIA

BY FORBES WATSON

VOL II - NO 37-)

نقد و نظر

از جناب نعیم عظیم برنی ایم اے

پاکستان میں ذہنی رجحانات مصنف۔ عبداللہ قدسی ناشر۔ بک لینڈ، محمد بلڈنگ بندر روڈ۔ کراچی۔ صفحات ۲۰۴۔ قیمت آٹھ ۔ کتابت وطباعت بہتر۔ گرد پوش سادہ مگر خوبصورت۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی کوشش کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے پاکستان میں ذہنی رجحانات کا جائزہ مختلف عنوانوں کے تحت لیا ہے۔ ترقی پسند تحریک، اردو ادب، تراجم، تنقید، تعلیم، آرٹ، مذہب، ادارے، قابلِ قدر کتابیں اور علمی ذخائر کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں "مصنف" نے کافی کاوش سے کام لیا ہے۔ یہ جائزہ گو مختصر ہے اور بعض عنوانات مثلاً تعلیم اور آرٹ تشنہ بھی معلوم ہوتے ہیں تاہم نقشِ اول ہونے کی حیثیت سے قابلِ قدر ہے اور کتاب کے حجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختصار کے سوائے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مذکورہ بالا جلی عنوانوں کے تحت افسانے، ناول، اردو غزل، موسیقی، رقص، فنِ تعمیر، مصوری وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ثقافتی، علمی و ادبی اداروں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور ان کی علمی و ادبی کوششوں کے نتائج بھی بالاختصار دیئے گئے ہیں: اس بارے میں تمام توجہ مغربی پاکستان پر مرکوز رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کی ادبی انجمنوں کا بھی ذکر ضروری تھا۔ یہ صحیح ہے کہ "بنگالی" عنوان کے تحت ان کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بنگالی ادب کو اردو میں، اور اردو ادب کو بنگالی میں منتقل کرنے کے لئے کی گئی ہیں یا کی جارہی ہیں مگر جو علمی و ادبی ادارے مشرقی پاکستان میں اردو یا بنگالی علم ادب کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے ہیں ان کی خدمات کے ذکر سے اس نوع کی تالیف کو معرا نہیں ہونا چاہیئے۔

کتاب کا انتساب جناب محمد علی صاحب (سابق وزیر اعظم پاکستان) کے اسمِ گرامی سے کیا گیا ہے اور پیش لفظ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے تحریر فرمایا ہے۔

ادارۂ علم و ادب علی گڑھ کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۹۵۶-۵۷ء یہ سالانہ رپورٹ ادارۂ مذکور کے جلسہ سال چہارم منعقدہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۶ء کی روئداد ہے جس کو ادارہ کے آنریری جنرل سکریٹری جناب محمد عمر خاں صاحب ثمر چھتاروی نے مرتب کیا ہے۔ اس جلسہ کی صدارت ملک کے مشہور رہنما عالی جناب عبدالمجید خواجہ صاحب رئیس و بیرسٹر علی گڑھ نے فرمائی تھی۔ جلسہ کی پہلی نشست کے بعد مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس میں شہر و مضافات کے شعرائے

کرام نے حصہ لیا۔ اس غیر طرحی مشاعرہ میں حصہ لینے والے شعراء کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔

ادارۂ مذکور کے اغراض و مقاصد "اردو زبان کی علمی و ادبی خدمت اور اس کی ترویج و ترقی نیز عوام میں صالح قدروں کی نشر و اشاعت" بیان کئے گئے ہیں۔

ادارہ دو شعبوں پر مشتمل ہے:۔

(۱) مکتب شبینہ جس میں کلام پاک کے علاوہ دینی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ "تعلیمی عملہ دو مستقل استادوں پر مشتمل ہے۔ مکتب میں درجہ ابتدائی سے درجہ پنجم تک تعلیم دی جاتی ہے۔ نادار طلبا کے لئے کتاب درسیہ مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اس مکتب میں سال زیر رپورٹ میں ۸۰ بچے زیر تعلیم تھے جن میں ۴۰ بچے مستقل اور ۴۰ بچے غیر مستقل طلباء تھے۔

طلبا میں ۶۴ لڑکے اور ۱۶ لڑکیاں شامل ہیں۔

مکتب سے متعلق ایک کلب بھی ہے جس کو "ہونہار کلب" نام دیا گیا ہے۔ اس کلب کا مقصد "بچوں کی ذہنی و تعلیمی و سماجی صلاحیتوں کی نشو و نما اور انہیں اُجاگر" کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے "بچے ایک دو بار جمع ہو کر تقریر و تحریر، مکالمے، کہانیاں نظموں اور بیت بازی وغیرہ کے پروگرام میں... سرگرم حصہ لیتے ہیں"

(۲) دوسرا شعبہ ایک دارالمطالعہ ہے جس میں ہر علم و فن کی تقریباً ۸۰ کتابیں موجود ہیں۔ "مکتب کے طلباء اور صاحب ذوق حضرات نیز جامعہ اردو علی گڑھ کے طلبا اس سے خاطر خواہ مستفید ہوتے رہتے ہیں"

مکتب کی مالی حالت کا انحصار ماہانہ چندوں پر اور عطیات و چرم قربانی پر ہے۔ دارالمطالعہ کیلئے عطیات کتب بھی موصول ہوئے ہیں۔ سال زیر رپورٹ میں آمدنی ۱۴۰۹ روپیہ ۴ر۳ پائی ہوئی اور سال گزشتہ کی تحویل ۵۱۸ روپیہ ۹ر۳ پائی ملاکر کل رقم ۱۹۲۷ روپیہ ۱۳ر۶ پائی ہوتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں سال زیر رپورٹ میں اخراجات کی میزان ۱۳۵۷ روپیہ ۱۰ر۳ پائی ہوتی ہے۔ اس طرح سال کے آخر میں ۵۷۰ روپے ۳ر۳ پائی کی بچت ہوئی۔

رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کی قلت اور معقول عمارات کی نایابی ادارہ کی ترقی میں سد راہ ہیں اور اس مشکل کا حل مخیر اصحاب کی مالی اعانت پر منحصر ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مستطیع اور مخیر اصحاب اس ادارہ کی مالی امداد کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

ع نئے چمن میں بہاروں کی اَب کمی کیا ہے

(عائشہ یوسف)

نہیں جو رنج سے خوگر وہ آدمی کیا ہے
سکوتِ غم نہیں حاصل تو زندگی کیا ہے

خوشی سے خوش نہیں انسان تو خوشی کیا ہے
نہیں جو روح ہی خنداں تو پھر ہنسی کیا ہے

بجا یہ مستی و سرشاریِ غمِ محبوب
غمِ حیات سے اے دِل! یہ بے رخی کیا ہے

غلط نہیں کوئی تمثیل بے بسیِ بشر
مگر یہ عشق سے پوچھو کہ بے بسی کیا ہے

مناؤ جشنِ بہاراں ہر آن اہلِ چمن
نئے چمن میں بہاروں کی اب کمی کیا ہے

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۰ جون ۱۹۵۹ء کو خواتین کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

کانفرنس کے محسن

یکم فروری لغایۃ ۳۱ مئی ۱۹۵۹ء

نام	مقام	روپے
گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان	لاہور	۱۰۰۰/-/-
میسرز اسٹینڈرڈ ویکیسر آئل کمپنی	کراچی	۵۰۰/-/-
معرفت شعبۂ نسواں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	"	۱۳۹/۴/-
میسرز محمد احمد اینڈ برادرز	"	۱۲۵/-/-
میسرز حبیب بنک لمیٹڈ کراچی	"	۱۰۰/-/-
جناب سید زین العباد صاحب رضوی	"	۴۵/-/-
معرفت محترمہ بیگم علوی صاحبہ } برائے طالبات سرسید گرلس کالج کراچی	"	۶۰/-/-
جناب کیپٹن ڈاکٹر محمد ایوب صاحب } برائے طالبات سرسید گرلس کالج کراچی	کوئٹہ	۶۰/-/-
میسرز حاجی عباد اللہ } برائے طالبات سرسید گرلس کالج کراچی	کراچی	۳۵/-/-
جناب مولوی عبداللہ صاحب	"	۳۰/-/-
" نذیر حسین صاحب زیدی	"	۲۰/-/-
جناب پرنسپل صاحبہ گورنمنٹ گرلس کالج ایبٹ آباد	ایبٹ آباد	۱۶/-/-
جناب اخلاص حسین صاحب ایم ۔ اے	کراچی	۱۰/-/-
" مولوی عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈوکیٹ	"	۱۰/-/
" سردار محمد عمر خاں صاحب	راولپنڈی	۱۰/-/-
" ضیغم عباس علی صاحب		۱۰/-/-
" پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج چکوال		۶/-/-
جناب نور محمد صاحب	لاہور	۸/-/-
" طفیل احمد صاحب	راولپنڈی	۶/۸/-
" مصطفےٰ صدیقی صاحب ایڈوکیٹ کراچی		۸/-/-
" پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج منٹگمری		۶/-/-
جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ بوائز سکنڈری اسکول منوڑا کراچی		۵/-/-
" پرنسپل صاحب سندھ کالج آف کامرس حیدرآباد		۸/-/-

D. O. No. 53/2/Spl/59-879

27th April, 1959.

My dear Syed Sahib,

Many thanks for a copy of the book entitled - "Talib-Ilam-Ki-Diary". I have literally raced through the book. It is written in a charming and simple style. It is a very human document. Some of the personalitie portrayed in it are most fascinating. Many social evil have been depicted and the picture presented is one that evokes sympathy. The great merit of your treatment of the social evils lies in the fact that it never degenerates into a bitter tirade. I am sure that your book will be enjoyed by every one who reads it.

Yours sincerely,

Nmkhan

(N. M. Khan)

Syed Altaf Ali Brelvi,
Secretary, A.P.Educational Conference,
"Saeeda Manzil"
near Sir Syed Girls College,
Nazimabad Chaurangi, No.1.
KARACHI.

AL-ILM

A Quarterly Organ

of

The Academy of Educational Research

ALL PAKISTAN EDUCATIONAL CONFERENCE

Editor:
SYED ALTAF ALI, Brelvi